ڈاکٹر عبادت بریلوی

آہوانِ صحرا

اِدارۂ ادب و تنقید ۞ لاہور

ڈاکٹر عبادت بریلوی

آہوانِ صحرا

اِدارۂ ادب و تنقید ○ لاہور

تصنیف : آہوانِ صحرا
مُصنّف : پروفیسر ڈاکٹر عبادت بریلوی
ناشر : فرحان عبادت ڈپٹی ڈائریکٹر
ادارۂ ادب و تنقید لاہور
سرورق : سیّد انور حسین شاہ نفیس رقم لاہور
مطبع : ندیم یونس پرنٹرز لاہور
کتابت : سیّد محمد ابراہیم خوشنویس ۔ جامعہ اشرفیہ لاہور
جلدسازی : مدنی بُک بائینڈنگ ہاؤس لاہور
اہتمام طباعت : سیّد محمد ابراہیم جامعہ اشرفیہ فیروز پور روڈ لاہور
تاریخ اشاعت : ۱۹۹۰
تعاون : اکادمی ادبیات پاکستان ۔ اسلام آباد
قیمت : ۷۰/- ستر روپے

اِنتساب

○

اپنے عزیز شاگردوں

کے نام

○

جن سے میں نے محبت کی ہے، جن کو بہت کچھ سکھایا بھی ہے
اور جن سے بہت کچھ سیکھا بھی ہے!

عبادت بریلوی

ہمہ آہوانِ صحرا سرِ خود نہادہ بر کف
بہ اُمیدِ آں کہ روزے بہ شکار خواہی آمد

(حضرت امیر خُسرو دہلویؒ)

فہرست

⑤

⑥

⑦

⑧

پیش لفظ

ہمہ آہوانِ صحرا سرِ خود نہادہ برکف
بہ امیدِ آں کہ روزے بہ شکار خواہی آمد

جب بھی میں اپنے دوستوں، رفیقوں، شاگردوں اور پڑھنے والوں کو یاد کرتا ہوں تو حضرت امیر خسرو دہلویؒ کا یہ شعر زبان پر آجاتا ہے، اور اس پہلودار اور حسین شعر کی معنویت میری رگ و پے میں سرایت کر جاتی ہے۔

اس حیات مستعار میں مجھے اچھے رفقائے کار، اعلیٰ پائے کے دوست اور جذب و شوق سے سرشار شاگرد ملے، اور میں اُن سے متاثر ہوا۔ اُنہوں نے ہمیشہ میرے ساتھ تعاون کیا اور وہ ہمیشہ میرے کاروبارِ حیات کو چلانے میں مُمِد و معاون ثابت ہوئے۔

یہ کتاب "آہوانِ صحرا" ایسے ہی چند دوستوں، رفیقوں، شاگردوں اور پڑھنے والوں کی شخصیات کے خاکوں پر مُشتمل ہے۔ اُنہوں نے اپنے اپنے مخصوص شعبوں میں جو کارہائے نمایاں انجام دیئے ہیں، وہ ہماری تعلیمی، علمی، معاشرتی، تہذیبی اور ادبی زندگی میں سُنہرے حروف سے لکھے جانے کے قابل ہیں۔ میں نے تو اِن کی شخصیتوں کے صرف چند پہلوؤں کی جھلکیاں ہی دکھانے

کی کوشش کی ہے۔ لیکن اِن سے اُن کی اہمیت کا اندازہ بخوبی ہو جاتا ہے۔

میرے یہ دوست اور عزیز محبت کے پُتلے، اخلاص کے پیکر اور جذب وجنوں کے مجسّمے تھے۔ ہر آزمائش پر پورا اُترنا اُن کا نصب العین تھا۔

گُزشتہ چند سال سے میں اس دور کی اہم تہذیبی اور ادبی شخصیات پر کام کر رہا ہوں۔ شخصیات کے ان خاکوں کے چھ مجموعے (۱) رہ نوردانِ شوق (۲) آوارگانِ عشق (۳) جلوہ ہائے صد رنگ (۴) یارانِ دیرینہ (۵) بلاکشانِ محبت اور (۶) غزالانِ رعنا۔ اِس سے قبل شائع ہو چکے ہیں۔ "آہوانِ صحرا" اس سلسلے کی ساتویں کتاب ہے۔ اس کے علاوہ چار اور مجموعے (۱) شجر ہائے سایہ دار (۲) خوش نوایانِ چمن، (۳) شوریدگانِ شوق اور (۴) صفیرانِ سحر۔ کتابت وطباعت کی منزلیں طے کر رہے ہیں۔ یہ بھی انشاء اللہ جلد شائع ہوں گے۔

میں نے کوشش کی ہے کہ اِن دلچسپ شخصیات کے مطالعے میں اُن کے عہد کی تہذیبی، معاشرتی، اخلاقی اور علمی وادبی زندگی کے مختلف پہلوؤں کی تصویریں بھی آنکھوں کے سامنے بے نقاب ہو جائیں۔ اس کا مقصد بھی اسلامیان پاکستان وہند کی زندگی کے مختلف پہلوؤں سے نقاب اُٹھانا اور اُن کی رنگا رنگ خصوصیات کا جلوہ دکھانا ہے۔

اس لئے کہ ادب اور ادبی تاریخ کے مطالعے کا پودا اسی زمین میں پھیلتا بڑھتا اور پروان چڑھتا ہے۔

عبادت بریلوی

لاہور

یکم نومبر ۱۹۹۰ء

ڈاکٹر تاثیر

ڈاکٹر تاثیر اُردو کے نامور شاعر اور نقاد اور ایک مشہور و معروف ماہر تعلیم تھے۔ اُنھوں نے اپنے عہد کے بے شمار شاعروں اور ادیبوں کی آبیاری کی اور انہیں شعر و ادب کی دُنیا میں تناور درخت بنا دیا۔ وہ ایک مخلص دوست، ایک بذلہ سنج انسان اور ایک بے تکلف سادہ اور صاف شخصیت کے مالک تھے۔ وہ ایک مجلسی آدمی تھے اور اپنی خداداد ذہانت سے احباب کی محفلوں کو زعفران زار بنانے کا گُر انہیں خوب آتا تھا۔ وہ زندگی کو خوش اسلوبی کے ساتھ بسر کرنے کا فن جانتے تھے اور اپنے اقوال و افعال سے اپنے احباب اور مِلنے والوں کو بھی اس کی طرف توجہ دلاتے تھے۔

تاثیر صاحب انگریزی زبان و ادب کے پروفیسر تھے۔ اُنھوں نے اُس زمانے میں کیمبرج یونیورسٹی سے انگریزی ادب میں پی ایچ ڈی کی ڈگری حاصل کی جب ہندوستان کے طالب علموں کا انگلستان کی یونیورسٹیوں میں اعلےٰ تعلیم حاصل کرنا آسان نہیں تھا۔ سفر کی دُشواریاں، داخلے کی پابندیاں اور مالی مشکلات اُن کا راستہ روکتی تھیں، تاثیر صاحب کا تعلق ہندوستان کے متوسط طبقے کے گھرانے سے تھا لیکن اس کے باوجود علم حاصل کرنے کا شوق اُنہیں کشاں کشاں سات سمندر پار لے گیا اور اُنھوں نے وہاں کی سب سے اہم یونیورسٹی میں انگریزی ادب کی اعلےٰ تعلیم حاصل کی، انگریزی ادب اور جنوبی ایشیا پر

پروفیسر سر آرتھر کوئلر کاؤچ PROFESSOR SIR ARTHUR QUILLER COUCH اور پروفیسر ٹلیارڈ PROFESSOR TILYARD کی نگرانی میں گراں قدر تحقیقی کام کیا۔ وہاں سے وطن واپس آکر وہ اپنی زبان اُردو میں شعروادب کی تخلیق کا کام کرتے رہے جس کی وجہ سے اپنے دور کی نامور ادبی شخصیات میں اُن کا شمار ہونے لگا۔

میری طالب علمی کے زمانے میں تاثیر صاحب کی شاعری اور تنقید کی شہرت اپنے عروج پر پہنچ چکی تھی اور میں جدید ادب کے ایک طالب علم کی حیثیت سے اُن کی ادبی تخلیقات کو بڑے ذوق و شوق سے پڑھتا تھا۔ اُن کی تحریروں میں جو نیا احساس، نیا شعور اور وہ جو ایک ترقی پسندانہ زاویۂ نظر تھا، اُس سے مجھے دلچسپی تھی۔ اسی لئے میں اُنہیں اپنے قبیلے کا آدمی سمجھتا تھا۔

دوسری جنگ عظیم کے زمانے میں تاثیر صاحب نے اسلامیہ کالج لاہور کی پروفیسری کو چھوڑ کر حکومت ہند کی ملازمت کر لی تھی، اور شملہ میں اُن کا قیام تھا۔ میں اُس زمانے میں لکھنؤ یونیورسٹی سے ام۔اے کرنے کے بعد ملازمت کی تلاش میں سرگرداں تھا۔ اسی زمانے میں حکومت ہند کی طرف سے کسی جگہ کے لئے اشتہار نکلا۔ میں نے درخواست دے دی۔ اس کے جواب میں تاثیر صاحب کا شملہ سے خط آیا جس میں اس پوسٹ کی کچھ تفصیل تھی اور یہ بھی لکھا تھا کہ وہ اس معاملے میں میری پوری طرح مدد کریں گے۔ تاثیر صاحب سے یہ میرا پہلا غائبانہ تعارف تھا۔ انہوں نے میری مدد کی۔ یہ اور بات ہے کہ میں اس سے فائدہ نہ اُٹھا سکا کیونکہ میں پی ایچ ڈی کے لئے تھیسز لکھنے میں مصروف تھا۔ اور لکھنؤ سے باہر جا کر ملازمت کرنا میرے لئے ممکن نہ تھا۔ بہر حال اس بہانے سے تاثیر صاحب سے میرا تعارف ہو گیا اور اس کے بعد اُن کی شفقت اور محبت مجھے ہمیشہ حاصل رہی۔ وہ مجھے خط لکھتے رہے، اور میں اُن سے اپنے تحقیقی مقالے کے سلسلے میں بھی مشورہ کرتا رہا، اور وہ میری مدد کرتے رہے۔

پھر مجھے دِلّی یونیورسٹی کے اینگلو عربک کالج میں ملازمت مِل گئی۔ تاثیر صاحب اُس زمانے میں دِلّی آگئے تھے۔ اُن کا دفتر علی پور روڈ پر تھا۔ میں ام۔اے اور بی۔اے آنرز کی جماعتوں کو

پڑھانے کے لئے یونیورسٹی جاتا تھا۔ واپسی پر کچھ وقت علی پور روڈ کے سکریٹریٹ میں اپنے احباب بلونت سنگھ، جگن ناتھ آزاد، اور عرش ملسیانی کے ساتھ گذارتا تھا۔ یہیں تاثیر صاحب سے اُن کے دفتر میں میری مُلاقات ہوئی۔

میں نے اُن کو اطلاع کروائی تو اُنھوں نے فوراً مجھے بُلالیا، اور اس طرح مِلے اور باتیں کیں جیسے برسوں کی مُلاقات ہے۔ دراصل وہ ادبی آدمی تھے، اور ادب کے رشتے سے وہ مجھے جانتے تھے۔ میرے کچھ مضامین لاہور کے رسالوں میں شائع ہوئے تھے۔ تاثیر صاحب نے یہ مضامین پڑھے تھے۔ میں نے بھی اُن کی نظمیں غزلیں اور مضامین رسالوں میں پڑھے تھے۔ اس لئے میں اُن سے بخوبی آشنا تھا۔

اس پہلی مُلاقات میں تاثیر صاحب نے میرا حال احوال معلوم کیا، اور پوچھا "آپ کا تحقیقی مقالہ اب کس منزل میں ہے"؟

میں نے کہا "خاصا کام ہوگیا ہے۔ انشاء اللہ چند مہینے میں تیار ہو جائے گا تو اُس کو یونیورسٹی میں پیش کردوں گا۔ اُردو تنقید کے ارتقاء پر میں نے کئی باب مکمل کر لئے ہیں۔ صرف دو باب باقی ہیں"۔

تاثیر صاحب نے کہا "آپ کا موضوع بہت دلچسپ ہے۔ مجھے بھی اس موضوع سے دلچسپی ہے۔ ٹائپ ہو جائے تو مجھے بھی دکھائیے گا"۔

میں نے کہا "ضرور ایک کاپی پیش کروں گا"۔

اس زمانے میں میرے مضامین خاصی تعداد میں ادبی رسائل میں شائع ہوتے تھے۔ تاثیر صاحب کو اس کا علم تھا۔ اُنھوں نے یہ مضامین پڑھے تھے۔ اس لئے انھوں نے اپنے مخصوص انداز میں مجھ سے پوچھا "آپ اتنا کام کیسے کر لیتے ہیں"؟

میں نے کہا "بس یہی لکھنا پڑھنا میرا اوڑھنا بچھونا ہے۔ کالج میں پڑھانے کا کام بھی ایسا کچھ زیادہ نہیں ہے۔ ہفتے میں چار لیکچر ام۔اے کے ہیں، اور دو تین بی۔اے آنرز کے۔ اس لئے مجھے لکھنے پڑھنے کے لئے خاصا وقت مِل جاتا ہے۔ میں اس وقت کو ضائع نہیں کرتا۔ دو گھنٹے صبح کو اور دو تین گھنٹے رات کو لکھتا ہوں۔ میری کوئی

اور دلچسپی نہیں ہے۔ اور پھر میں تنہا آدمی ہوں۔ اینگلو عربک کالج ہوسٹل میں رہتا ہوں۔ لکھنے پڑھنے میں اچھا وقت گذر جاتا ہے"۔

ابھی تک تاثیر صاحب سنجیدگی سے باتیں کر رہے تھے۔ لیکن جب میں نے یہ کہا کہ میں تنہا آدمی ہوں تو اُن کی طبیعت رواں ہوگئی۔

کہنے لگے "ادبی کام کرنے والے کے لئے تنہا رہنا ضروری ہے۔ جتنا وقت بھی مل جائے اچھا ہے۔ گھر بسانا اور بیوی بچوں کے جنجال میں پھنسنا ادبی کام کرنے والے کے لئے مناسب نہیں ــ دیکھو مجھے جو دیدۂ عبرت نگاہ ہو"۔

میں نے کہا "لیکن آپ تو اس 'جنجال' میں پھنسنے کے باوجود خاصا ادبی کام کرتے ہیں"۔

کہنے لگے "یار! دودھ ملتا ہو تو گائے پالنے سے کیا فائدہ! بڑی آزمائشوں سے گذرنا پڑتا ہے وقت ضائع بہت ہوتا ہے۔ انسان پابہ زنجیر ہو جاتا ہے۔ شادی وادی کے جال میں پھنسنا نہیں چاہیئے"۔

تاثیر صاحب کی باتوں میں خاصی شوخی اور بذلہ سنجی تھی۔ مجھے ان باتوں میں مزہ آیا لیکن میں چُپ رہا مُسکراتا رہا اور انہیں یہ تاثر دیتا رہا کہ جو کچھ وہ کہہ رہے ہیں وہ صحیح ہے۔

کوئی ایک گھنٹہ میں تاثیر صاحب کے پاس بیٹھا اور اُن کی دلچسپ باتیں سُن کر محظوظ ہوتا رہا۔

اس زمانے میں دہلی یونیورسٹی اولڈ وائسریگل لاج کی عمارتوں میں تھی۔ یونیورسٹی میں طلباء کو لیکچر دینے کے بعد میں تاثیر صاحب کے پاس تھوڑی دیر کے لئے اُن کے دفتر میں علی پور روڈ ضرور جاتا تھا، اور اُن کی دلچسپ باتوں سے لُطف اندوز ہوتا تھا۔ وہ بڑے ہی خوش گفتار آدمی تھے، اور بہت جلد بے تکلف ہو جاتے تھے۔ طبیعت میں شوخی اور بذلہ سنجی بھی بہت تھی۔ اُن کی باتیں سننا ایک نہایت خوش گوار تجربہ تھا۔ باتیں کرتے تھے تو یوں محسوس ہوتا جیسے پھلجڑیاں سی چھوٹ رہی ہیں۔

اس زمانے میں ہندوستان کی آزادی اور قیام پاکستان کی تحریک اپنے شباب پر

تھی۔ ہر مُسلمان پاکستان کی تشکیل کا خواب دیکھ رہا تھا۔ لیکن ابھی تک صورت حال واضح نہیں تھی۔ مذاکرات ہو رہے تھے۔ بحثوں کا سلسلہ جاری تھا۔ جلوس نکل رہے تھے۔ سیاست کی گرمی اپنے شباب پر تھی۔

اسی زمانے میں جامعہ ملیہ اسلامیہ کی جوبلی کے سلسلے میں کچھ جلسے جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی میں ہوئے۔ اس کے روح رواں شیخ الجامعہ ملیہ اسلامیہ ڈاکٹر ذاکر حسین خاں صاحب تھے۔ اُنہوں نے جوبلی کے جلسوں میں کانگریس اور مسلم لیگ دونوں جماعتوں کے لیڈروں کو مدعو کیا تھا۔ اس میں قائدِ اعظم اور گاندھی جی دونوں نے شرکت کی تھی۔ اور اس کی بدولت وقتی طور پر خاصی یگانگت کا ماحول پیدا ہو گیا تھا۔

ایک اجلاس میں دیکھا کہ تاثیر صاحب اور بخاری صاحب بھی موجود ہیں۔ یہ دونوں اجلاس شروع ہونے سے قبل پنڈال کے باہر آپس میں باتیں کر رہے تھے۔ آج اِن دونوں نے کھدّر کی شیروانیاں زیب تن کی تھیں اور سروں پر شدھ کھادی کی گاندھی ٹوپیاں پہن رکھی تھیں۔ میں اِن دونوں کو اس لباس میں دیکھ کر کچھ حیران ہوا۔ کیونکہ یہ لوگ اس زمانے میں زیادہ تر نہایت عمدہ قسم کے سوٹ پہنتے تھے۔

بخاری صاحب سے تو میری کوئی خاص ملاقات تھی نہیں۔ البتہ تاثیر صاحب سے میں کسی حد تک بے تکلف تھا اس لئے اُن سے مُلاقات ہوئی تو میں نے کہا "آج یہ کھدّر کی شیروانی اور گاندھی ٹوپی میں آپ بہت اچھے لگ رہے ہیں"۔

تاثیر صاحب کہنے لگے "یار! جیسا دیس ویسا بھیس۔ آج جامعہ کی جوبلی میں ماحول ہی کچھ ایسا ہے کہ یہ لباس اچھا لگ رہا ہے۔ موقع کی مناسبت سے یہ لباس پہننے کی خواہش میرے دل میں بیدار ہوئی"۔

میں نے کہا "یہ لباس تو بہت اچھا ہے۔ میں خود عام طور پر شیروانی پہنتا ہوں۔ لیکن گاندھی ٹوپی مجھے اچھی نہیں لگتی۔ مولانا آزاد نے کانگریسی ہونے کے باوجود کبھی گاندھی ٹوپی نہیں پہنی۔ ہمیشہ قراقلی کی اونچی دیوار کی ٹوپی پہنتے تھے"۔

کہنے لگے "ذاکر صاحب کی خوشی کے لئے میں نے ایسا کیا ہے"۔

میں نے کہا"لیکن ذاکر صاحب تو بڑے روشن خیال آدمی ہیں۔ اِن باتوں کا خیال نہیں کرتے۔ ان کو کوئی اہمیت نہیں دیتے۔ آج آپ سوٹ ہی پہنتے تو اچھا ہوتا۔ سوٹ آپ کے جسم پر بہت اچھا لگتا ہے"۔

تاثیر صاحب میری بات سمجھ گئے، ایک قہقہہ لگایا اور یہ کہہ کر چپ ہو گئے کہ"یار! کبھی کبھی ایسا بھی ہونا چاہیئے"۔

پھر چند مہینے کے بعد کانگریس مسلم لیگ اور کیبنٹ مشن کے درمیان طویل مذاکرات کے نتیجے میں قیام پاکستان کا اعلان ہو گیا۔ ہم سب نے قیام پاکستان کے اعلان کے فوراً بعد لاہور جانے کا پروگرام بنایا۔ چند مہینے بعد بخاری صاحب گورنمنٹ کالج لاہور کے پرنسپل کی حیثیت سے اور تاثیر صاحب اسلامیہ کالج کے پرنسپل کی حیثیت سے لاہور چلے گئے۔

میں اُس آشوب قیامت سے دوچار ہونے کے لئے دِلّی میں رہ گیا۔ آزادی کے زیر سایہ دِلّی میں مسلمانوں کا قتلِ عام ہوا۔ مجھے بھی رفیوجی ہونا پڑا۔ پُرانے قلعہ کے کیمپ کے دلدوز مناظر بھی دیکھنے پڑے۔ بالآخر میں بھی کسی طرح لاہور پہنچا۔ جہاں اورینٹل کالج میں مجھے اُردو کی سینئر لیکچر شپ مِل گئی۔

لاہور پہنچ کر اور اورینٹل کالج میں قدم جما کر میں نے سوچا کہ تاثیر صاحب سے مُلاقات کرنی چاہیئے۔ چنانچہ ایک دن میں اُن کے مکان ۶۔ میسن روڈ پر گیا۔ تاثیر صاحب اس وقت گھر پر موجود نہیں تھے۔ اُن کی بیگم صاحبہ سے مُلاقات ہوئی۔ اُنہوں نے کہا کہ"تاثیر صاحب کسی کام سے باہر گئے ہیں، لیکن جلد ہی آجائیں گے۔ آپ چند منٹ انتظار کر لیجیئے"۔

میں نے کہا"میں بغیر اطلاع کے حاضر ہو گیا ہوں۔ یہ بات مناسب تو نہیں ہے لیکن میں تاثیر صاحب کو SURPRISE دینا چاہتا تھا۔ اس لئے آنے سے قبل اطلاع نہیں دی"۔

وہ کہنے لگیں"آپ تاثیر صاحب کے مزاج سے واقف ہیں۔ انہیں اطلاع دینے کی ضرورت نہیں ہوتی۔ وہ تو وقت مُقرر کئے بغیر ہر ایک سے ملتے ہیں۔ کسی کے لئے یہاں کوئی روک ٹوک نہیں"۔

بیگم تاثیر نے مجھ سے فصیح اُردو میں باتیں کیں، اور میں یہ دیکھ کر حیران ہوا کہ وہ انگریز خاتون ہونے کے باوجود بے تکلفی سے فصیح اُردو میں باتیں کرتی ہیں۔

یہ سب کچھ تاثیر صاحب کی رفاقت اور تربیت کا ادنےٰ کرشمہ تھا۔

میں اُن سے باتیں کر رہا تھا کہ اُن کے بچے سلیٰمی، مریم اور سلمان بھی آگئے۔ انہوں نے بھی مجھ سے اُردو میں باتیں کیں، اور اپنی شوخیوں سے ماں کا ناک میں دم کر دیا۔

یہ دیکھ کر میری حیرانی میں کچھ اور بھی اضافہ ہوا۔

میں نے بیگم تاثیر سے کہا "میں تو اس خیال میں تھا کہ آپ کے گھر میں انگریزی ماحول ہوگا۔ لیکن یہاں تو ہر لحاظ سے مشرقی ماحول ہے"۔

کہنے لگیں "اس میں زیادہ ہاتھ تو تاثیر صاحب کی تربیت کا ہے لیکن میں نے بھی اس سلسلے میں بہت کچھ کیا ہے، ہمارے درمیان اس معاملے میں خاصی مفاہمت ہے۔ تاثیر صاحب جو کچھ چاہتے ہیں، میں اس پر عمل کرتی ہوں۔ اور اُن کی وجہ سے میں بھی اب ایک مشرقی عورت ہوں۔ مغربی زندگی کے انداز و آداب کو تو میں انگلستان میں چھوڑ آئی ہوں"۔

بیگم تاثیر نے اپنے ڈرائنگ روم میں دیر تک مجھ سے اس طرح کی باتیں کرتی رہیں۔ اُنہوں نے میرا حال احوال پوچھا۔ میں نے دِلّی کے حالات بیان کئے اور اس آشوب قیامت کی تفصیل اُنہیں سُنائی جن میں سے گذر کر میں لاہور پہنچا تھا۔ بیگم تاثیر نے افسوس کا اظہار کیا اور میرے ساتھ ہمدردی کی۔ جس سے یہ اندازہ ہوا کہ وہ نہایت نرم دل اور انسان دوست خاتون ہیں۔

ہم لوگ یہ باتیں کر ہی رہے تھے کہ تاثیر صاحب آگئے۔ بڑی محبت سے ملے۔ میرے پاس صوفے پر بیٹھ گئے۔ اپنا جوتا اُتار کر ایک طرف پھینکا جس کو اُن کی بیگم نے اُٹھالیا، اور دوسرے کمرے میں لے گئیں۔ تھوڑی دیر میں وہ چپّل لے کر آئیں جو انہوں نے تاثیر صاحب کے پاس رکھ دیئے۔ میں یہ منظر دیکھ کر حیران ہوا اور یہ سوچتا رہا کہ انگریز بیویاں بھی اپنے شوہروں کا اتنا خیال رکھ سکتی ہیں۔ میں نے بیگم تاثیر کی داد دی۔

تاثیر صاحب نے اپنے مخصوص مزاحیہ انداز میں کہا "بیویوں کو ایسا ہی ہونا چاہیئے۔

شوہر کی خدمت کرنی چاہیئے۔ اس سے محبت میں اضافہ ہوتا ہے۔ اور آپس میں مفاہمت کی فضا پیدا ہوتی ہے"۔

بیگم تاثیر یہ سب کچھ سنتی رہیں اور زیرلب مسکراتی رہیں۔ میں اس منظر سے محظوظ ہوتا رہا۔ اب تاثیر صاحب میری طرف متوجہ ہوئے۔ کہنے لگے "کب آئے؟ دلی میں کیسی گذری؟" میں نے کہا "تاثیر صاحب! کچھ نہ پوچھیئے، قیامت گذر گئی۔ کئی دن تک کالج کے آس پاس گولیاں چلتی رہیں۔ سارے شہر میں مسلمانوں کا قتل عام ہوتا رہا۔ پولیس اور فوج بھی اس میں شریک تھی۔ بالآخر ہم لوگوں کو کالج چھوڑنا پڑا۔ پاکستان کے ہائی کمشنر زاہد حسن صاحب نے ہمیں اپنے ہاں بلا لیا۔ اُن کا گھر "گل رعنا" بھی اچھا خاصا رفیوجی کیمپ بن گیا۔ چند روز وہاں رہے۔ پھر پرانے قلعے میں جاکر مسلمانوں کے لئے کیمپ قائم کیا۔ کئی دن بھوکے پیاسے رہے۔ لاکھوں مسلمان پرانے قلعے میں آگئے۔ میں تو ان مناظر کو برداشت نہ کرسکا۔ اس لئے پھر زاہد صاحب کے ہاں چلا گیا۔ جہاں سے ہندوستان کے وزیر مواصلات رفیع احمد قدوائی صاحب نے مجھے کسی طرح ہوائی جہاز میں لکھنؤ بھیجا۔ جان بچ گئی۔ اب میں دلی سے لاہور آیا ہوں۔ اورینٹل کالج میں مجھے سینئر لکچرر شپ مل گئی ہے۔ پنجاب یونیورسٹی نے خصوصی آفر بھیج کر مجھے بلایا ہے۔ اس سلسلے میں آپ سے مشورہ ضروری تھا چنانچہ میں آپ کے پاس بغیر اطلاع کے آگیا ہوں"۔

تاثیر صاحب کہنے لگے "بہت اچھا کیا کہ آپ میرے پاس آگئے۔ اور بغیر اطلاع کے آئے۔ دلی میں مسلمانوں کے لئے اب رہنا مشکل ہے۔ وہاں تو اب آئے دن قتل عام ہوتا رہے گا۔ اورینٹل کالج میں ابھی نیا نیا ام۔ اے اردو کھلا ہے۔ ام۔ اے کی تدریس کے لئے آپ کو پنجاب یونیورسٹی نے آفر بھیجا تھا۔ وائس چانسلر ڈاکٹر عمر حیات ملک صاحب نے اس معاملے میں مجھ سے بھی رائے لی تھی۔ میں نے اُن سے اتفاق کیا تھا۔ آپ یہاں اطمینان سے رہیئے اور کام کیجئے۔ یہاں لاہور میں ادبی کام کرنے کا بھی خاصا ماحول ہے"۔

میں نے کہا "اب تو میں یہاں آگیا ہوں۔ مجھے آپ کی مدد اور رہنمائی کی ضرورت ہوگی۔"
تاثیر صاحب نے کہا "سب کچھ ٹھیک ہوجائے گا۔ اب اس شہر میں دل لگائیے، اور

علمی ادبی کام کیجیے۔ آپ کے لئے یہاں کا ماحول اجنبی اور نامانوس نہیں ہے۔ کیونکہ ادب کی دُنیا میں لوگ آپ کو جانتے ہیں۔ اورینٹل کالج میں بھی کام کرنے اور آگے بڑھنے کے بہت امکانات ہیں۔

میں نے کہا "میں آپ کی رہنمائی میں کام کروں گا۔ آپ کی مُشفقانہ باتوں نے ہمیشہ میری ہمّت بڑھائی ہے اور آپ نے میرے اندر لاہور میں رہنے اور کام کرنے کا حوصلہ پیدا کیا ہے"۔

کوئی گھنٹہ ڈیڑھ گھنٹہ میں تاثیر صاحب کے پاس بیٹھا، اور اُنہوں نے میرے ساتھ جو باتیں کیں اُن سے میری معلومات میں اضافہ ہوا، اور میری اجنبیت بڑی حد تک دور ہوئی۔

تاثیر صاحب اُس زمانے میں اسلامیہ کالج لاہور کے پرنسپل ہو گئے تھے، اور لاہور کے تعلیمی اور تہذیبی نظام میں اُن کی بڑی عزّت تھی۔ وہ اکثر علمی ادبی محفلوں میں بھی اپنی گل افشانئ گفتار سے پھول بکھیرتے ہوئے نظر آتے تھے۔ لاہور میں اس زمانے میں مشاعروں کا خاصا زور تھا۔ اِن میں بیشتر مشاعروں کی صدارت تاثیر صاحب کرتے تھے۔ الحمرا میں روزانہ کوئی نہ کوئی ادبی محفل ہوتی تھی۔ تاثیر صاحب اِن محفلوں میں نمایاں نظر آتے تھے۔

میں اُن سے ملنے کے لئے کبھی اسلامیہ کالج میں اور کبھی اُن کے مکان پر چلا جاتا تھا۔ تاثیر صاحب مجھ پر شفقت فرماتے تھے۔ میرے علمی ادبی کام میں دلچسپی کا اظہار کرتے تھے۔ میں اُن سے استفادہ کرتا تھا۔ اس زمانے میں جو مضامین میں نے لکھے، اور جو کتابیں شائع کیں، اُن میں تاثیر صاحب کی رہنمائی کا خاصا ہاتھ تھا۔ وہ مجھے نئے نئے موضوعات سُجھاتے تھے، اور میں اُن کی باتوں سے متاثر ہو کر خاصی تعداد میں مضامین لکھا کرتا تھا۔ اُردو کے کلاسیکی اور جدید ادب دونوں پر اُن کی نظر بڑی گہری تھی۔ وہ بڑے روشن خیال تھے، اور ترقی پسندانہ زاویہ نظر سے ادبی مسائل پر اظہار خیال کرتے تھے۔ اُن کا علم بہت وسیع، اور اُن کا مزاج تجزیاتی تھا۔ اس لئے اُن کی باتیں بڑی ہی خیال انگیز ہوتی تھیں۔

ایک دن میں ترقی پسند ادیبوں کے بارے میں باتیں کر رہا تھا۔ دوران گفتگو میں نے اُن سے پوچھا "ترقی پسند ادب کی تحریک میں شدت پسندی بہت ہے۔ بیشتر ترقی

پسند ادیبوں کا رجحان اشتراکیت اور اشتمالیت کی طرف ہے۔ کیا آپ اِس کو صحیح سمجھتے ہیں؟

تاثیر صاحب نے کہا "آپ کی بات صحیح ہے۔ ہر تحریک میں شروع شروع میں انتہا پسندی ہوتی ہے۔ لیکن رفتہ رفتہ اس میں توازن پیدا ہو جاتا ہے۔ گذشتہ پندرہ بیس سال میں ترقی پسند ادیب خاصے متوازن ہو گئے ہیں۔ بیشتر ترقی پسند ادیبوں کا رُجحان اشتراکیت کی طرف ہے لیکن ہر ترقی پسند کے لئے اشتراکی ہونا ضروری نہیں ہے۔ البتہ اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ اشتراکی یا کمیونسٹ بڑا دانا عقل مند اور باشعور ہوتا ہے۔ کیونکہ وہ علم کی روشنی میں زندگی کے حقائق کا سُراغ لگاتا ہے، اور انسان دوستی اُس کے خیالات میں بُنیادی حیثیت رکھتی ہے"۔

میں نے کہا "میں اِس سے مُتفق ہوں۔ لیکن اب ترقی پسند ادبی تحریک کے بعض علم بردار ادیبوں سے یہ مطالبہ کر رہے ہیں کہ ادیبوں کو مزدوروں اور کسانوں کے ساتھ جا کر فیکٹریوں اور کھیتوں میں کام کرنا چاہیئے۔ اسی صورت میں وہ ایسے ادب کی تخلیق کر سکتے ہیں جو صحیح معنوں میں ترقی پسند ہو"۔

تاثیر صاحب نے جواب دیا "یہ بات ویسے اپنی جگہ صحیح ہے، اور اس قسم کے خیالات کا اظہار ایسے لوگ کرتے ہیں جن کا تعلق پارٹی سے ہے۔ لیکن ہر ترقی پسند ادیب کے لئے ضروری نہیں کہ وہ پارٹی سے تعلق رکھے، اور اُس کا کام بھی کرے۔ ترقی پسند ادیب کو تو بس انسان دوست ہونا چاہیئے، اور اس کی تخلیقات میں آس پاس اور گرد و پیش کی مزاج دانی کا شعور ضروری ہے۔ تاکہ وہ مثبت زاویۂ نظر کو سامنے رکھ کر انسان دوستی کی اقدار کے ساتھ اپنی ادبی تخلیقات کو پیش کرے۔ اس مُلک میں جو بھی لکھنے والے ہیں، وہ سب کے سب کسی ایک نظریے کے قائل تو نہیں ہو سکتے"۔

یہ سُن کر میرے اندر ہمت پیدا ہوئی اور میں نے کہا "۱۹۴۸ء میں میں نے ایک طویل مضمون اُردو ادب کی ترقی پسند تحریک کے بارے میں لکھا تھا جو ادب نقوش میں شائع ہوا ہے۔ میں نے اس میں انہیں خیالات کا اظہار کیا ہے لیکن اس پر آج کل بہت لے

دے ہو رہی ہے۔ میں نے اس میں یہ بات واضح کی ہے کہ ہر ترقی پسند ادیب کا اشتراکی ہونا ضروری نہیں ہے۔ یہ بھی ضروری نہیں ہے کہ ترقی پسند ادیب قلم کو چھوڑ کر فیکٹریوں اور کھیتوں میں جا کر مزدوروں اور کسانوں کے ساتھ کام کرے۔"

تاثیر صاحب نے کہا "میں نے آپ کا وہ مضمون پڑھا ہے، آپ نے اُس میں جو کچھ لکھا ہے وہ صحیح ہے۔ مجھے آپ سے اتفاق ہے۔ اس مضمون میں اُردو ادب کی ترقی پسند تحریک کا تاریخی و تنقیدی جائزہ بڑے متوازن انداز میں پیش کیا گیا ہے۔ آپ چند لوگوں کے اعتراضات کی پروا نہ کیجیے۔"

اِن خیالات کو سُن کر میری بہت سی اُلجھنیں دور ہوئیں، اور میرے اندر ایک اعتماد پیدا ہوا۔ تاثیر صاحب ایک اچھے اُستاد اور متوازن خیالات رکھنے والے ادیب اور نقاد تھے، اور نوجوان لکھنے والوں کو انہیں راستوں پر گامزن کرتے تھے۔ اُنہوں نے اپنے عہد کے بہت سے ادیبوں اور شاعروں کی رہنمائی کی۔

اِن میں سب سے اہم مثال تو فیض صاحب کی ہے۔ بہت کم لوگوں کو اس بات کا علم ہے کہ انہوں نے آج سے تقریباً نصف صدی قبل فیض صاحب کی رہنمائی کی، اور اس رہنمائی کی بہ دولت وہ ادب و شعر کے افق پر آفتاب و ماہتاب بن کر اُبھرے۔

تاثیر صاحب کیمبرج سے پی ایچ ڈی کر کے واپس آئے تو ۱۹۳۷ء میں ام۔ اے او کالج امرتسر کے پرنسپل ہو گئے۔ اُنہوں نے انگریزی کے لیکچرار کی حیثیت سے فیض صاحب کو بھی اس کالج میں بُلا لیا۔ یہاں وہ اعلیٰ درجے کی شاعری کرتے رہے۔ لیکن شاعری کے ساتھ ساتھ تاثیر صاحب نے اُنہیں جدید اُردو شاعری کے موضوع پر پی ایچ ڈی کے لئے تحقیقی مقالہ لکھنے کی طرف بھی توجہ دلائی۔ چنانچہ فیض صاحب نے بڑی محنت سے اس تحقیقی مقالے کا خاکہ تیار کیا۔ اس کا عنوان تھا۔ "جدید اُردو شاعری (۱۸۵۷ - ۱۹۳۹)

MODERN URDU POETRY (1857 - 1939) یہ خاکہ تاثیر صاحب کی نگرانی میں تیار کیا گیا۔ اُس زمانے میں پی ایچ ڈی کے تحقیقی مقالے انگریزی زبان میں لکھے جاتے تھے۔ فیض صاحب نے بھی یہ خاکہ انگریزی زبان میں تیار کر کے

پنجاب یونیورسٹی میں پیش کیا۔ تاثیر صاحب نے اس پر یہ نوٹ لکھا کہ درخواست دہندہ نے میری نگرانی میں یہ کام کیا ہے۔ جو کام اب تک اُنہوں نے کیا ہے، اُس کے پیش نظر یہ کہا جا سکتا ہے کہ وہ اس موضوع پر پی ایچ ڈی کے لیئے کام کرنے کے اہل ہیں۔ میرا خیال ہے کہ یہ کام جب مکمل ہو جائے گا تو انسانی علوم میں گراں قدر اضافے کا باعث ہو گا"۔

"The applicant has worked under my direction. The work already done by him qualifies him to be accepted as a candidate for the degree of Ph.D. I think that his work, when completed, be a valuable addition to human knowledge."

اس خاکے میں پندرہ باب تھے۔ افسوس ہے کہ یونیورسٹی نے اپنی قدامت پسند کی وجہ سے اس کو منظور نہیں کیا، ورنہ تاثیر صاحب کی نگرانی میں فیض صاحب جدید اُردو شاعری کے موضوع پر ایک اہم کتاب تیار کرتے جو اُردو تنقید میں ایک بیش بہا اضافہ ہوتی۔ بہرحال فیض صاحب کے ہاتھ کا لکھا ہوا یہ خاکہ میں نے کسی طرح تلاش کر لیا، اور اس کو ایک مقدمے کے ساتھ نہایت اہتمام سے شائع کر دیا۔ مجھے خوشی اس بات کی ہے کہ ایک عظیم شاعر کی ایک اہم دستاویز ضائع ہونے سے بچ گئی، اور اب یہ ہماری شاعری اور تنقید کی تاریخ کا ایک حصّہ ہے۔

۱۹۴۱ء میں تاثیر صاحب سری پرتاپ کالج کے پرنسپل ہو کر سری نگر چلے گئے جہاں انہوں نے مسلمانانِ کشمیر کی تعلیم کے سلسلے میں اہم کارنامے انجام دیئے۔ مسلمان نوجوانوں میں تعلیم کا ذوق و شوق پیدا کیا۔ شیخ عبداللہ مرحوم سے اُن کے ذاتی تعلقات نے اُنہیں کشمیر کی سیاست میں بھی حصّہ لیا۔ یہ بات مشہور ہے کہ انہوں نے شیخ صاحب اور قائداعظم کی ملاقات کا بھی منصوبہ بنایا تھا تاکہ پاکستان بننے کے بعد کشمیر کا الحاق پاکستان کے ساتھ ہو۔

غرض تاثیر صاحب اپنے عہد کی ایک اہم ادبی اور سیاسی شخصیت تھے۔ اُنھوں نے بڑے بڑے ادیبوں اور شاعروں کی آبیاری کی اور اُن کی اس آبیاری سے جدید اُردو ادب میں گراں قدر اضافے ہوئے۔ قیام پاکستان سے قبل، اور اس کے بعد لاہور میں اُس وقت کے تقریباً تمام ادیبوں اور شاعروں نے تاثیر صاحب کی ادبی بصیرت سے استفادہ کیا، اور اس میں کسی شک و شبہ کی گنجائش نہیں کہ اُنھوں نے صحیح ادبی فضا کو پیدا کرنے میں بڑے اہم کارنامے انجام دیئے۔ وہ شاعر اور ادیب ہونے کیساتھ ساتھ ادیب گر بھی تھے۔

میں اُس زمانے میں نوجوان تھا، اور ادبی دُنیا میں میری حیثیت نو وارد کی تھی۔ میرے تنقیدی مقالات تو مختلف ادبی موضوعات پر رسالوں میں شائع ہوتے رہتے تھے لیکن ابھی تک کوئی کتاب شائع نہیں ہوئی تھی۔ تاثیر صاحب نے مجھے اِن مضامین کو کتابی صورت میں شائع کرنے کی طرف توجہ دلائی، اور کئی ملاقاتوں میں بعض اہم ادبی موضوعات پر کتابیں لکھنے کی طرف بھی مجھے آمادہ کیا۔ چنانچہ میں نے اُن کی تجویز پر دو ضخیم کتابیں "روایت کی اہمیت" اور "غزل اور مطالعہ غزل" طباعت و اشاعت کے لئے تیار کیں جو انجمن ترقی اُردو پاکستان کی طرف سے شائع ہوئیں اور جن کو بہت پسند کیا گیا۔ ان کے علاوہ مختلف موضوعات لکھے ہوئے تنقیدی مضامین کا مجموعہ "تنقیدی زاویے" کے نام سے مکتبۂ اُردو لاہور نے شائع کیا۔

ان کاموں کے ساتھ ساتھ میں جدید شاعری کے مختلف مسائل پر بھی کام کرتا رہا، اور اس موضوع پر ایک ضخیم کتاب تیار کی جو تاثیر صاحب کے انتقال کے بعد شائع ہوئی۔ تاثیر صاحب کا خیال تھا کہ انگریزی کی طرح اُردو میں بھی مختلف شاعروں اور ادیبوں پر بھی کام ہونا چاہیئے جس میں سوانحی مواد کے ساتھ ساتھ ان کا تنقیدی تجزیہ بھی ہو۔ میں نے اُن کی یہ بات گرہ میں باندھی، اور ولی، میر تقی میر، خواجہ میر درد، غالب اور مومن وغیرہ پر بھی مبسوط کتابیں لکھیں، جو یکے بعد دیگرے مختلف اشاعتی اداروں سے شائع ہوتی رہیں۔ قدیم قلمی نسخوں پر کام کرنے کا شوق بھی اُنھوں نے میرے دل میں پیدا کیا، اور میں نے اُن سے مُتاثر ہو کر بے شمار نادر و نایاب قلمی نسخوں کی ورق گردانی کی، اور اِن میں سے گذشتہ چند سال میں تقریباً چالیس قلمی نسخوں پر کام کیا۔ اِن میں سے بیشتر قلمی نسخے شائع ہو چکے ہیں۔

اِن کی اشاعت نے اُردو کی ادبی تاریخ کے بہت سے خلا پُر ہوئے ہیں، اور بعض محققوں، مؤرخوں اور نقادوں کا خیال ہے کہ اِن کو سامنے رکھ کر اُردو ادب کی تاریخ کو نئے سرے سے ترتیب دینے اور از سرِنو نئے انداز سے لکھنے کی ضرورت ہے۔

آج کل میں اسی کام میں مصروف ہوں۔ زندگی نے وفا کی اور زمانے نے فرصت دی تو یہ کام انشاء اللہ جلد مکمل ہو جائے گا، اور اس کا سہرا تاثیر صاحب کی رہنمائی کے سر ہوگا۔

تاثیر صاحب مختلف علوم پر گہری نظر رکھتے تھے لیکن مختلف ملکوں کے ادبیات کا مطالعہ اُنہوں نے خاص طور پر بڑے ذوق و شوق سے کیا تھا۔ وہ ادب میں جدید رُجحانات اور پہلو دار اظہار کے علم بردار تھے۔ اسی لئے اُن کی شاعری میں یہ رُجحانات اپنے شباب پر نظر آتے ہیں۔ اُن کی نظمیں "اگلے وقتوں کے شاعران کرام" اور "رس بھرے ہونٹ پھول سے ہلکے" کارزار وغیرہ اپنے جدید طرزِ اظہار، نئے خیالات اور جذبات واحساسات اور نئی تصویر کاری و علامات کی وجہ سے آج بھی دِلوں کو لُبھاتی ہیں اور حواس پر سرخوشی بن کر چھا جاتی ہیں۔

یہ اشعار اپنے پہلو دار اظہار کی وجہ سے کتنے دلکش اور کس درجہ مؤثر ہیں ؎

اگلے وقتوں کے شاعرانِ کرام
کِس قدر خوش نصیب ہوتے تھے
شب ماہتاب پائے ساقی پر
اپنا سر رکھ کے خوب سوتے تھے
صبح دم قطرہ ہائے شبنم سے
موتیوں کی لڑی پروتے تھے
پھول کو دیکھ کر چہکتے تھے
اور بُلبل سے مل کے روتے تھے
کاٹتے تھے فراق کی راتیں
اور اُلفت کے بیج بوتے تھے
کس قدر خوش نصیب ہوتے تھے
اگلے وقتوں کے شاعراں کرام

رس بھرے ہونٹ پھول سے ہلکے
جیسے بلّور کی صُراحی میں
بادۂ آتشیں لفس چھلکے
جیسے نرگس کی گول آنکھوں سے
ایک شبنم کا ارغواں قطرہ
شفقِ صبح سے درخشندہ
دھیرے دھیرے، سنبھل سنبھل ڈھلکے
گھری گھری پلکوں کی
اونچی اونچی دیواریں ہیں
ترچھی ترچھی نظروں کی
اوچھی اوچھی تلواریں ہیں

دیواریں گر گر پڑتی ہیں
تلواریں ٹوٹی جاتی ہیں (کارزار)

تاثیر صاحب کا مجموعۂ کلام "آتش کدہ" جس میں اُن کی جدید طرز کی منتخب نظمیں اور غزلیں شامل ہیں، جدید شاعری کے پہلو دار طرز اظہار کا ایک حسین مُرقع ہے اور جدید اُردو شاعری میں ایک شاہکار کی حیثیت رکھتا ہے۔ تاثیر صاحب کی بے شمار تحریریں رسالوں میں بکھری پڑی ہیں۔ اُنہیں کتابی صورت میں شائع کرنے کی ضرورت ہے تاکہ نئی نسل کو اُن کی ادبی اہمیت کا اندازہ ہو۔

قیام پاکستان کے بعد تاثیر صاحب کے مزاج میں بڑی سنجیدگی پیدا ہو گئی تھی۔ اور شوخی کا خاتمہ ہو گیا تھا۔ شاید اس کی وجہ یہ تھی کہ اُن پر کام کا بوجھ بہت زیادہ تھا۔ اسلامیہ کالج کی پرنسپلی اُن کا خاصا وقت لیتی تھی۔ اِس کے علاوہ وہ بہت سی تعلیمی اور تہذیبی و ثقافتی کمیٹیوں کے ممبر بھی تھے۔ سیاست میں بھی انہیں دلچسپی تھی۔ اس میں بھی اُن کا خاصا وقت صَرف ہو جاتا تھا۔ یونیورسٹی کے معاملات و مسائل کو سلجھانے میں بھی وہ خاصے مصروف رہتے رہتے تھے۔ ایک خبر یہ بھی گرم تھی کہ وہ پنجاب یونیورسٹی کے وائس چانسلر ہونے والے ہیں۔ مستقل وائس چانسلر ڈاکٹر عمر حیات ملک تو سفیر ہو کر انڈونیشیا چلے گئے تھے۔ جسٹس ایس۔ اے رحمٰن صاحب قائم مقام وائس چانسلر تھے۔ لیکن وہ ہائی کورٹ کے کاموں میں زیادہ مصروف رہتے تھے۔ اس لئے تاثیر صاحب کو یونیورسٹی کے لئے خاصا وقت دینا پڑتا تھا۔ دوستوں کے لئے اُن کے دروازے بھی ہمیشہ کھلے رہتے تھے۔ غرض ان تمام مصروفیات نے تاثیر صاحب کو سنجیدہ بنا دیا تھا۔ اب اُن کی شگفتگی بہت کم ہو گئی تھی۔ فقرے تراشنے اور لطیفے سُنانے کا وقت بھی اُنہیں نہیں ملتا تھا۔ اب وہ اپنے بے تکلف احباب کے ساتھ بھی سنجیدگی سے بات کرنے لگے تھے۔ اس زمانے میں ان کے خیالات و نظریات میں بھی تبدیلی آنے لگی تھی۔ اب وہ ترقی پسند ادیبوں کے اشتراکی خیالات کے قائل نہیں رہے تھے۔ اب پاکستان کے بدلے ہوئے حالات کے پیش نظر اُن کا خیال تھا کہ اس

وطن عزیز میں پاکستانی اقدار کو فروغ ہونا چاہیئے، اور انہیں بنیادوں پر اس ملک کے سیاسی، معاشرتی اور تہذیبی ماحول کی تشکیل ہونی چاہیئے تاکہ یہ ملک اس ماحول میں ترقی کی منزلیں طے کرنے میں خاطر خواہ کامیاب ہو۔ یوں کہنا چاہیئے کہ وہ اب صحیح اور سچے پاکستانی ہوگئے تھے۔ یہ تبدیلی محض جذباتی نہیں تھی۔ تاثیر صاحب نے یہاں کے ماحول کو دیکھ کر اور اس کا تاریخی جائزہ لے کر اپنے آپ کو اس راستے پر گام زن کیا تھا۔ اب وہ پوری طرح اشتراکی نہیں رہے تھے۔

دراصل اب وہ پاکستان کی خدمت کرنے کے خواہش مند تھے، اور اس کو ترقی کے راستے پر رواں دواں دیکھنا چاہتے تھے۔ یہ فیصلہ اُنھوں نے بدلتے ہوئے حالات کے پیش نظر بہت سوچ سمجھ کر بروقت کیا تھا۔

تاثیر صاحب بلا کے ذہین اور نہایت دانش مند انسان تھے۔ پاکستان میں آکر اُن کے تاریخی اور تہذیبی شعور نے یہ بھانپ لیا تھا کہ نظریات کی یہ تبدیلی پاکستان کے حق میں ہے۔ اُن کے یہ خیالات بر بنائے خلوص و محبت تھے۔ اس لئے ان سے میں نے نظریات کی اس تبدیلی پر کبھی کوئی بات نہیں کی اور ایک تماشائی کی حیثیت سے یہ دیکھتا رہا کہ ان کی شخصیت میں اِس تبدیلی کا نتیجہ کیا ہوتا ہے۔

افسوس ہے کہ تاثیر صاحب کو اس زمانے میں کام کرنے کے لیئے زیادہ وقت نہ مِل سکا۔ اُن کی صحت جواب دینے لگی۔ اور ایک دن صبح کو اچانک یہ خبر جنگل کی آگ کی طرح لاہور میں پھیل گئی کہ تاثیر صاحب کو رات کے وقت دل کا دورہ پڑا اور وہ اچانک اللہ کو پیارے ہوگئے۔ دن بھر وہ معمول کے مطابق کام کرتے رہے۔ رات کو وہ کسی دعوت میں شریک ہوئے، اُس کے بعد گھر واپس آئے لیکن رات کو دل کے دورے سے جاں بر نہ ہوسکے اور اُن کا انتقال ہوگیا۔ اس خبر نے سارے شہر بلکہ سارے ملک میں کہرام مچا دیا۔ بے شمار آنکھیں فرطِ غم سے مجھے اشکبار نظر آئیں، اور دوسرے دن اُن کے ہزارہا شاگردوں، دوستوں، ادیبوں، شاعروں، صحافیوں اور عزیزوں نے انہیں میانی صاحب کے قبرستان میں سُپردِ خاک کردیا۔ میں اُن کے جنازے میں شریک تھا۔ بڑے ہی دل دوز

مناظر دیکھنے میں آئے۔

تاثیر صاحب کے اس طرح چلے جانے سے یہ شہر، اس کا علمی و ثقافتی ماحول، تعلیمی فضا اور اُن کے بے شمار احباب سب کے سب بے یار و مددگار ہو گئے۔ زندگی کے مختلف شعبوں میں ایسا خلا پیدا ہوا جو کبھی بھی پُر نہ ہو سکا۔ لاہور کی ثقافتی اور ادبی زندگی میں اُداسیاں راج کرنے لگیں اور ویرانیوں کا بسیرا نظر آنے لگا۔

زندگی میں تاثیر صاحب کی مصروفیات بے شمار تھیں۔ وہ ایک نامور ماہر تعلیم، ایک مشہور و معروف سماجی اور تہذیبی و ثقافتی کارکن اور ایک بلند پایہ شاعر اور ادیب تھے۔ انہیں کاموں میں اُن کا زیادہ وقت گذرتا تھا۔ انہوں نے اسلامیہ کالج لاہور کے پرنسپل کی حیثیت سے کالج کو ترقی کے راستے پر گامزن کرنے میں اہم کارنامے انجام دیئے۔ کالج کے نامور اساتذہ مشہور ادیب اور ماہر تعلیم پروفیسر حمید احمد خاں اور ڈاکٹر سعید اللہ کا تعاون انہیں حاصل رہا۔ پنجاب یونیورسٹی کی مختلف کمیٹیوں میں تعلیمی ماحول کو صحیح ڈگر پر چلانے کیلئے انہوں نے ایک عظیم رہنما کا کردار ادا کیا، اور ایک بلند پایہ شاعر اور ادیب کی حیثیت سے اُردو ادب اور شاعری کو انتہائی بلندیوں سے ہم کنار کر دیا۔ ان تمام شعبوں میں اُنہوں نے جو گراں قدر خدمات انجام دیں اُن کو کبھی بھی فراموش نہیں کیا جا سکتا۔

میں اُن کی شفقت اور محبت کو کبھی بھول نہیں سکتا۔ میں نے اُن سے بہت کچھ سیکھا، اور تہذیب و ادب سے جو دلچسپی، اور کام کرنے کی تھوڑی بہت لگن اور دُھن جو میرے اندر ہے، اُس کو پیدا کرنے میں میرے شفیق اساتذہ کے ساتھ ساتھ تاثیر صاحب کی عظیم شخصیت کا ہاتھ بھی ہے۔

آج بھی میں اُنہیں یاد کرتا ہوں، اور اُن کی باغ و بہار شخصیت کی یاد روشنی کا ایک مینار بن کر مجھے راستہ دکھاتی اور میری رہنمائی کرتی ہے۔

پروفیسر خواجہ منظور حسین

پروفیسر خواجہ منظور حسین انگریزی زبان و ادب کے نامور پروفیسر تھے۔ اُن کا نام برِعظیم پاکستان و ہند کے شہرۂ آفاق پروفیسر، پروفیسر سِدھانت، پروفیسر بخاری، پروفیسر جھا، پروفیسر سراج الدین، پروفیسر حمید احمدؒ خاں اور پروفیسر احمدؒ علی کے ساتھ لیا جاتا ہے۔ وہ انگریزی ادبیات کے بہت بڑے ماہر تھے۔ اُن کا مطالعہ بہت وسیع تھا۔ انگریزی ادبیات کے مختلف پہلوؤں پر اُن کی نظر بڑی گہری تھی۔ اُنھوں نے زندگی بھر ادبیات کا مطالعہ کیا۔ اس کے مختلف پہلوؤں کے بارے میں سوچا، غور کیا اور ایسے ایسے پہلو نکالے، ایسے ایسے نکتے پیدا کئے کہ ادبیات کے مطالعے کو بہ ذاتِ خود ایک علم اور ایک فن بنا دیا۔ اُن کو انگریزی ادبیات کے علم و شعور کا ایک بیش بہا خزانہ کہا جائے تو بے جا نہیں۔

ایک زمانے تک خواجہ صاحب مسلم یونیورسٹی علی گڑھ میں انگریزی زبان و ادب کے اُستاد رہے، اور لاتعداد طالب علموں کو انھوں نے اپنے علم سے مالا مال کیا۔ اُن کے ادبی ذوق کو نکھارا، اور انہیں ادب کے راستے پر گامزن کر کے انسان دوست بنایا۔ وہ ایک نہایت شفیق اُستاد اور انسان دوست آدمی تھے۔ طالب علموں کو اپنا مال و متاع سمجھتے تھے، اور اپنے علم کے خزانے کو اُن کے سینوں میں محفوظ کر دینے کو اپنا فرض

منصبی جانتے تھے۔ اُنھوں نے جس طرح اپنے شاگردوں اور ادب سے دلچسپی لینے والوں کی رہنمائی کی ہے، اس سے وہ پہچانے جاتے تھے۔ اس اعتبار سے اُن کی شہرت کی خوشبو دور دور تک پھیل گئی تھی۔ نہ صرف اپنی یونیورسٹی میں بلکہ ہندوستان کی دوسری یونیورسٹیوں میں بھی وہ مشہور تھے، اور انگریزی ادبیات کے طالب علم اُن کی بڑی عزت کرتے تھے۔

سب سے بڑی بات یہ تھی کہ اُن کا زاویۂ نظر ترقی پسندانہ تھا۔ وہ بڑے ہی روشن خیال آدمی تھے۔ اُردو ادب کی ترقی پسند تحریک اور اُس کے علم برداروں کے ساتھ اُن کا رابطہ تھا، اور وہ لوگ بھی اُن سے استفادہ کرتے تھے۔ خواجہ صاحب سے غائبانہ تعارف انہیں لوگوں کے ذریعے سے ہوا۔ علی گڑھ میں ڈاکٹر اشرف، خواجہ غلام السیدین، محمود الظفر، سید سجاد ظہیر وغیرہ ان کے احباب خاص تھے۔ میں اس زمانے میں لکھنؤ یونیورسٹی میں بی۔ اے کا طالب علم تھا۔ اِن لوگوں سے اکثر لکھنؤ میں مُلاقات ہوتی تھی، اور یہ سب مجھ پر شفقت فرماتے تھے۔ اِن سے میرا مِلنا جُلنا علمی استفادے کی غرض سے تھا۔ یہ لوگ دورانِ گفتگو خواجہ منظور حسین صاحب کا ذکر بڑی محبت سے کرتے تھے اور اُن کے علم و فضل اور ادبی معاملات میں اُن کے علم اور اُن کی دانش و بصیرت کے معترف تھے۔ اِن کی باتوں نے مجھے غائبانہ طور پر خواجہ صاحب کا گرویدہ بنا دیا۔

اور پھر جب اُن سے پہلی مُلاقات ہوئی تو جو کچھ میں نے اُن کے بارے میں سُنا تھا، اُس کی مکمل ویڈیو فلم میری آنکھوں کے سامنے آگئی۔ خواجہ صاحب اُس زمانے میں جوان بلکہ نوجوان تھے، اور اُستاد سے زیادہ ایک طالب علم معلوم ہوتے تھے۔ ان کی عمر اس وقت چالیس کے لگ بھگ تھی لیکن پچیس تیس سال سے زیادہ نہیں معلوم ہوتے تھے۔ میانہ قد، سڈول بھرا بھرا جسم، سرخ سفید چمپئی رنگ، سر پر انگریزی طرز کے بال، گلے تک بند علی گڑھ کٹ کی شیروانی اور چوڑی دار پاجامے میں ملبوس، خواجہ صاحب مجھے دیکھنے میں ایک فرشتہ معلوم ہوئے۔ یوں محسوس ہوا

جیسے اللہ تعالیٰ نے اُنہیں اپنے ہاتھ سے بنایا ہے۔

میں نے خواجہ صاحب کو دیکھ کر یہ اندازہ لگالیا کہ وہ بولتے کم ہیں، اور حد درجہ کم آمیز اور کم سخن ہیں۔ اس لئے میں نے خود ہی اپنا تعارف کرایا اور کہا کہ "میں لکھنؤ یونیورسٹی میں بی۔ اے آنرز کا طالب علم ہوں۔ انگریزی ادبیات کا دلدادہ ہوں۔ انگریزی ادبیات کے پروفیسر سدھانت اور دیا موائے مترا کی شاگردی کا شرف مجھے حاصل ہے لیکن غائبانہ طور پر میں اپنے آپ کو آپ کا بھی شاگرد سمجھتا ہوں۔ میرے کچھ ساتھی علی گڑھ میں آپ کے شاگرد ہیں۔ اُن کے توسط سے میں نے غائبانہ طور پر آپ سے استفادہ کیا ہے۔ وہ جب بھی ملتے ہیں آپ کی شخصیت کی رعنائی و زیبائی اور علم و فضل اور شفقت و محبت کا ذکر اس طرح کرتے ہیں کہ میری گردن آپ کے سامنے جُھک جاتی ہے اور آپ سے علمی استفادہ کرنے کی خواہش دل میں مچلنے لگتی ہے۔ آج یہی خواہش مجھے آپ کے پاس یہاں کھینچ لائی ہے۔ جیسا سنا تھا آپ کو ویسا ہی پایا۔"

خواجہ صاحب میری یہ باتیں سُن کر زیرِ لب مُسکرائے اور فرمایا۔ "آپ نے جو کچھ سُنا ہے، اُس میں خاصی مبالغہ آرائی ہے۔ ہمارے ہاں اُستاد اور طالب علم کے رشتے کی جو روایت ہے، اُس کی وجہ سے طالب علم اپنے استادوں کے بارے میں اس طرح کی مبالغہ آرائی کرنے کے لئے مجبور ہو جاتے ہیں۔ میں تو آپ ہی کی طرح انگریزی، فارسی اور اُردو ادبیات کا طالب علم ہوں۔"

میں اُن کی یہ باتیں سُن کر سوچتا رہا کہ خواجہ صاحب میں ایک بڑے پروفیسر اور اسکالر کی وہ تمام خصوصیات موجود ہیں جو اُس کو ایک اسکالر سے زیادہ ایک طالب علم سمجھنے پر مجبور کرتی ہیں۔ کیونکہ علم تو ایک بحرِ ذخّار ہے، اور اس میں ڈوب کر بھی ایک صحیح پروفیسر اور اسکالر اپنے آپ کو طالب علم ہی سمجھتا ہے ۔۔۔ اور اسی میں اُس کی بڑائی ہے۔

خواجہ صاحب کو اپنی بڑائی کا احساس بالکل نہیں تھا۔ وہ انگریزی ادبیات کے بہت بڑے عالم تھے۔ اُن کا مطالعہ بہت وسیع تھا۔ وہ اپنا زیادہ وقت مطالعے

میں صَرف کرتے تھے۔ پُرانی اور نئی کتابوں کا اُن کے پاس بہت بڑا ذخیرہ تھا نئی سے نئی کتابیں بھی وہ منگواتے رہتے تھے۔ انگریزی ادبیات سے متعلق کوئی ایسی کتاب نہیں تھی جو اُن کی دسترس میں نہ ہو۔ وہ اِن تمام کتابوں کو اپنے سینے میں اُتار لیتے تھے، اور جب طالب علموں کو پڑھاتے تھے تو اُن کو اپنے علم سے مالا مال کر دیتے تھے۔ لیکچروں میں وقت ضائع کرنے کے وہ قائل نہیں تھے۔ خواہ مخواہ بیکار قسم کی باتیں کرنا اُنہیں پسند نہیں تھا۔ اس لئے طالب علموں کی رہنمائی ذاتی سطح پر کرتے تھے، اور بڑی مانوس سی فضا میں اُن کو پڑھاتے تھے۔ اُن سے تبادلۂ خیال بھی کرتے تھے تاکہ اُن کا علم اُن کی شخصیت کا جُزو بن جائے۔ نئی معلومات اور نئے خیالات کو نوٹ بھی کروا دیتے تھے تاکہ یہ سب کچھ طالب علموں کے پاس محفوظ رہے۔ اُن کے پڑھانے کا طریقہ مُفید اور مُنفرد تھا۔

اِس کی وجہ یہ تھی کہ خواجہ صاحب آکسفورڈ یونیورسٹی کے تعلیم یافتہ تھے، اور اُنہوں نے انگلستان کے دورانِ قیام میں انگلستان کے بڑے بڑے پروفیسروں کو دیکھا تھا، اور اُن سے استفادہ کیا تھا۔ آکسفورڈ اور کیمبرج میں جہاں تک ادب پڑھانے کا تعلق ہے، اُس میں زور زیادہ تر ٹیوٹوریل پر دیا جاتا ہے۔ ٹیوٹوریل میں طالب علموں کی ذاتی سطح پر رہنمائی کی جاتی ہے، اُن کے ساتھ تبادلۂ خیال ہوتا ہے، اور ضروری باتیں انہیں نوٹ بھی کروا دی جاتی ہیں۔ بڑے بڑے پروفیسروں کے لیکچر یونیورسٹی میں ہوتے ہیں۔ اُن میں طالب علم شریک ہوتے ہیں، اور اُن کو سُن کر اپنے ٹیوٹر کے ساتھ لیکچروں کے مختلف موضوعات پر تبادلۂ خیال بھی کرتے ہیں۔ اس طرح اُن کے علم میں اضافہ ہوتا ہے، اور ایک ایسی خود اعتمادی پیدا ہو جاتی ہے جو طالب علم کی شخصیت کو چار چاند لگا دیتی ہے۔

خواجہ صاحب کی تدریس کا طریقہ یہی تھا۔ لیکن ویسے وہ باتیں بڑے ہی دلکش انداز میں کرتے تھے۔ بولتے تھے تو یوں محسوس ہوتا تھا جیسے پھولوں کی بارش ہو رہی ہے۔ لہجہ ایسا جیسے ایک جوئے نرم خرام اپنی تمام تر دلآویزی کے ساتھ نغمہ سرا ہو۔ اندازِ گفتگو

ایسا جیسے شہد و شکر کا کوئی چشمہ رواں ہو۔
خواجہ صاحب دلّی کی تہذیب کا مثالی نمونہ تھے۔ اُن کی صورت شکل میں، وضع قطع میں، لباس میں انداز گفتگو میں، لہجے میں دلّی کی تہذیب اپنی تمام تر رعنائیوں کے ساتھ جھانکتی ہوئی نظر آتی تھی۔ اُن کی شخصیت میں ایسی سادگی اور معصومیت کا احساس ہوتا تھا جو عام طور پر معصوم بچوں کی ہُمک میں اپنا جلوہ دکھاتی ہے۔ وہ نہایت پاک صاف، دُھلے دُھلائے اور پاکیزہ انسان تھے۔ اُن کو دیکھ کر کسی فرشتے کا خیال آتا تھا۔
ایک عمر اُنھوں نے علی گڑھ میں گذاری۔ علی گڑھ اُن سے اور وہ علی گڑھ سے پہچانے جاتے تھے۔ یونیورسٹی میں اُن کی بڑی عزّت تھی۔ طالب علم اُن کے علم سے مرعوب تھے، اور اُن کا احترام کرتے تھے۔ اساتذہ اُن کے دلدادہ اور ارباب اختیار اُن کے والا و شیدا تھے۔ اُن کی تہذیب اور شائستگی، خلوص اور بلند اخلاقی کا ہر شخص معترف تھا۔ اور نہ صرف علی گڑھ بلکہ سارے ہندوستان میں اُن کی شہرت کی خوشبو دُور دُور تک پھیلی ہوئی تھی، اور علمی و ادبی دُنیا میں اُن کو بڑے احترام کی نظروں سے دیکھا جاتا تھا۔
خواجہ صاحب تقریباً بیس پچیس سال علی گڑھ میں رہے لیکن قیام پاکستان کے بعد ہندوستان میں ایسی افراتفری پیدا ہوئی کہ ہر شخص انتشار کا شکار نظر آنے لگا۔ خاص طور پر مسلمان اس افراتفری اور انتشار کا زیادہ شکار ہوئے۔ علی گڑھ، جو مسلمانوں کا سب سے بڑا مرکز تھا، اس کی بُنیادیں بھی ہل گئیں۔ بڑے بڑے عالم اور پروفیسر پاکستان کی طرف ہجرت کرنے کے منصوبے بنانے لگے۔ خواجہ صاحب نے بھی رختِ سفر باندھا، اور اپنے خاندان کے ساتھ لاہور آ گئے۔ گورنمنٹ کالج لاہور میں اُن کو انگریزی زبان و ادب کی پروفیسر شپ مل گئی۔ چند سال بعد اس کالج کے پرنسپل بھی ہو گئے۔
میں اُس زمانے میں اورینٹل کالج کے شعبۂ اُردو میں ریڈر ہو کر آ گیا تھا۔ اس لئے خواجہ صاحب سے اکثر میری مُلاقات ہوتی تھی۔ کبھی میں اُن کے پاس گورنمنٹ کالج چلا جاتا تھا۔ کبھی وہ اورینٹل کالج میں تشریف لے آتے تھے۔ اس طرح لاہور میں مجھے

اُن سے علمی استفادے کا زیادہ موقع ملتا تھا۔ اس زمانے میں میں نے اُن سے بہت کچھ سیکھا، اور اُن کی جاذبِ نظر شخصیت نے میرے دل میں اپنی جگہ بنالی۔

خواجہ صاحب اپنے قبیلے کے آدمی تھے۔ ادب کی ترقی پسند تحریک سے اُن کی دیرینہ وابستگی تھی۔ علی گڑھ کے دورانِ قیام میں وہ اس تحریک کے ساتھ وابستہ رہے، اور لاہور میں بھی پردے کے پیچھے رہ کر اُنھوں نے اس تحریک کے لئے کام کیا۔ اُن کا علمی ادبی کام بھی اسی زمانے میں منظرِ عام پر آیا۔ اسی زمانے میں اُنھوں نے غزل پر اپنا کام مکمل کیا اور "غزل کا روپ اور بہروپ" کے نام سے اپنی کتاب کو شائع کرنے کا منصوبہ بنایا۔ یہ کام تو وہ ایک زمانے سے کر رہے تھے اور اُنھوں نے غزل کے مطالعے میں نئے زاویوں اور نئے پہلوؤں کو تلاش کرنے کی کوشش کی تھی۔ خاص طور پر صنفِ غزل کی سماجی اور عمرانی اہمیت کا سُراغ لگانا اُن کے پیشِ نظر تھا، اور اس سلسلے میں انھوں نے ایسے ایسے نُکتے نکالے تھے اور غزل کی معنویت میں ایسے ایسے پہلو تلاش کئے تھے کہ اس کو دیکھ کر عقل دنگ رہ جاتی تھی۔ غزل کا مطالعہ، اور اس کی علامتوں میں نئی معنویت کی تلاش کا خیال اس سے قبل کسی اور کو نہیں آیا تھا۔ خواجہ صاحب نے ہندوستان کی تاریخ، اور خصوصاً آزادی کی جدوجہد کے اَن گنت پہلوؤں کو غزل میں تلاش کیا، اور اس کام میں اپنی ساری زندگی صَرف کر دی۔ غزل کی تنقید میں خواجہ صاحب کا یہ کارنامہ ایسا ہے کہ اُس کو کبھی بھی فراموش نہیں کیا جا سکتا۔

گورنمنٹ کالج لاہور کے دورانِ قیام میں انھوں نے علامہ اقبالؒ پر بھی اپنے اس کام کو مکمل کیا جو "اقبالؒ اور چند دوسرے شاعر" کے نام سے کتابی صورت میں شائع ہو چکا ہے۔ اس کے مختلف حِصّے اُنھوں نے اورینٹل کالج ہی کی ایک محفل میں سنائے تھے۔ میں اس انجمن کا نگراں تھا۔ میں نے خواجہ صاحب سے درخواست کی تھی کہ وہ اس کے جلسے میں ہمیں اپنی نگارشات سے نوازیں۔ میری درخواست پر وہ اس کے لئے تیار ہو گئے، اور انھوں نے پہلے علامہ اقبالؒ کے مجموعۂ کلام 'بانگِ درا' پر اپنا مضمون پڑھا جو ایک نہایت ہی خوبصورت مطالعہ تھا۔ حاضرین نے اس کو غور سے سُنا،

خواجہ صاحب کی تنقیدی بصیرت سے استفادہ کیا، اور اُن کے طرزِ تحریر سے لُطف اندوز ہوئے۔ اس کے بعد اُنہوں نے اقبالؒ کی شاعری پر کئی مضامین اورینٹل کالج میں پڑھے۔ اب یہ تمام مضامین اُن کی کتاب "اقبال اور بعض دوسرے شاعر" میں شائع ہو چکے ہیں۔ علامہ اقبالؒ پر ان کی یہ کتاب نہایت خیال انگیز ہے اور اپنی تنقیدی بصیرت اور اندازِ تحریر کے اعتبار سے بڑی اہمیت رکھتی ہے۔

خواجہ منظور صاحب اپنی تحریروں کو ادبی دُنیا کے سامنے پیش کرنے میں بہت محتاط تھے۔ ادبی جلسوں میں شریک نہیں ہوتے تھے لیکن میرے پیہم اصرار پر وہ اورینٹل کالج کے ادبی جلسوں میں شریک ہوئے، اور اس طرح لوگوں کو یہ علم ہوا کہ وہ اُردو کے بہت بڑے نقاد ہیں، اور اُن کی تنقید ایک امتیازی حیثیت رکھتی ہے۔ اُن کی دونوں کتابیں اُردو غزل کا روپ بہروپ، اور اقبال اور بعض دوسرے شاعر اُردو تنقید میں گراں قدر اضافہ ہیں۔

اس زمانے میں خواجہ صاحب بہت مصروف رہتے تھے۔ انگریزی کی پروفیسری اور گورنمنٹ کالج کی پرنسپلی اُن کا خاصا وقت لیتی تھی۔ لیکن اس مصروفیت کے باوجود وہ اکثر اورینٹل کالج میں تشریف لاتے تھے، اور مجھے نوازتے تھے۔ نہایت بے تکلفی سے دل موہ لینے والے انداز میں ادبی موضوعات پر باتیں کرتے تھے۔ اُن کی باتوں سے میں نے ہمیشہ استفادہ کیا، بہت کچھ اُن سے سیکھا، اور میرے علم میں اُن سے اضافہ ہوا۔

خواجہ صاحب بڑے ہی وضع دار اور بلند اخلاق انسان تھے۔ اُن سے جب کبھی بھی ملاقات ہوتی تھی تو یوں محسوس ہوتا تھا جیسے ویرانے میں بہار آگئی ہے اور صحنِ چمن میں گُل و گلزار سے کِھل گئے ہیں۔

لاہور کے دوران قیام میں خواجہ صاحب سے اکثر ملاقات ہوتی تھی اور وہ ہمیشہ خندہ پیشانی سے پیش آتے تھے۔ خوب ہنستے اور مُسکراتے تھے، اور بڑی محبت سے حال احوال پوچھتے تھے۔ اُن کی گفتگو دِلّی کی مخصوص زبان میں ہوتی تھی۔ اکثر اپنی گفتگو میں کوئی ایسا محاورہ یا روزمرہ استعمال کرتے تھے کہ لُطف آجاتا تھا۔ بڑی بے تکلفی سے

باتیں کرتے تھے۔ لیکن رکھ رکھاؤ کو کبھی ٹھیس نہیں لگتی تھی۔ اورینٹل کالج کے علمی ادبی کاموں کے بارے میں اکثر پوچھتے تھے، اور اس کی تفصیل سُن کر خوش ہوتے تھے۔ مفید مشورے بھی دیتے تھے۔ ادب کے مختلف پہلوؤں پر اظہار خیال بھی کرتے تھے۔ اُن کی باتوں میں ہمیشہ کوئی نہ کوئی نکتہ اور کوئی نہ کوئی نیا خیال ضرور ہوتا تھا۔ وہ صرف ایک عالم اور ادیب ہی نہیں تھے، ایک پُرکشش انسان بھی تھے۔ میں نے اِن ملاقاتوں میں اُن کی دلچسپ اور خیال انگیز باتوں سے بہت کچھ سیکھا۔ اُنھوں نے جو راستے دکھائے تھے، اُن پر چلنے کی کوشش کی اور بہت سی نئی منزلوں سے ہم کنار ہوا۔

خواجہ صاحب کم آمیز ضرور تھے لیکن جس سے ملتے تھے بڑی محبت سے ملتے تھے۔ کبھی اجنبیت کا احساس نہیں ہونے دیتے تھے۔ بڑے اخلاق سے پیش آتے تھے۔ انھوں نے گورنمنٹ کالج میں گیارہ بارہ سال گذارے۔ خاصے عرصے تک پرنسپل بھی رہے۔ اس کالج کا پرنسپل بہت بڑا افسر اور بیوروکریٹ سمجھا جاتا تھا۔ خواجہ صاحب نے اپنی تہذیب شائستگی اور بلند اخلاقی سے اس روایت کو توڑ دیا۔ اُن کے دروازے ہر ایک کے لئے کھلے رہتے تھے اور وہ ہر ایک کی مدد بھی کرتے تھے۔ بات یہ ہے کہ وہ بُنیادی طور پر ایک پروفیسر اور ایک شفیق اُستاد تھے۔ اُن کی شفقت ہر ایک پر بے پایاں تھی۔ اپنی بڑائی کا انھیں احساس بالکل نہیں تھا۔ خاطر تواضع میں بھی ہمیشہ پیش پیش رہتے تھے۔

خواجہ صاحب سے میری آخری مُلاقات اُن کے انتقال سے دو تین سال قبل ہوئی۔ ہوا یوں کہ پروفیسر آل احمدؔ سرور صاحب ایک دفعہ علی گڑھ سے لاہور آئے تو میرے غریب خانے پر قیام کیا۔ ایک دن اُنھوں نے یہ خواہش ظاہر کی کہ وہ اپنے اُستاد اور دوست خواجہ منظور حسین صاحب سے ملنا چاہتے ہیں۔ میں نے خواجہ صاحب کو فون کیا۔ اُس زمانے میں وہ زمان پارک میں رہتے تھے۔ کہنے لگے "ابھی آجائیے میں انتظار کر رہا ہوں۔ آپ سے اور سرور صاحب سے مل کر مجھے بے حد خوشی ہو گی"۔ میں سرور صاحب کو لے کر اپنی گاڑی میں زمان پارک پہنچا۔ خاصی تلاش کے

بعد اُن کا مکان مِلا۔ خواجہ صاحب باہر برآمدے میں انتظار کرتے ہوئے نظر آئے۔ بڑی محبت سے مِلے۔ مجھے اور سرور صاحب دونوں کو گلے لگایا۔ اور پوچھا "آپ کو یہاں پہنچنے میں کوئی دِقّت تو نہیں ہوئی؟"

میں نے کہا "کوئی خاص دُشواری نہیں ہوئی۔ دو ایک جگہ پوچھنا ضرور پڑا۔ دو ایک لمبی سڑکوں پر موٹر بھی چلانی پڑی۔ لیکن مزہ آیا۔ زمان پارک خوب جگہ ہے۔ یہاں اونچے اونچے آسمان سے باتیں کرتے ہوئے درخت ہیں اور ہر طرف سبزہ ہے۔"

خواجہ صاحب کہنے لگے "بھئی، اسی وجہ سے تو میں یہاں رہتا ہوں۔ صبح شام مٹر گشت کرتا ہوں۔ اس سے طبیعت بحال رہتی ہے۔ یہاں سبزہ بہت ہے۔ ہوا بھی صاف شفاف ہے۔ خاموشی اور سکون بھی ہے۔ نہر بھی سامنے ہے۔ غرض مناظر فطرت سے لُطف اندوز ہونے کا یہاں خاصا سامان ہے۔"

یہ باتیں کرتے ہوئے خواجہ صاحب ہم لوگوں کو اپنے ڈرائنگ روم میں لے گئے۔ آرام دہ صوفوں پر ہمیں بٹھایا اور سرور صاحب سے مخاطب ہوئے۔

پوچھا "سرور صاحب! کب آئے؟"

سرور صاحب نے کہا "مجھے لاہور آئے ہوئے دو تین دن ہو گئے ہیں۔ عبادت صاحب کا مہمان ہوں۔ جس دن سے آیا ہوں۔ یہ خواہش دل میں مچل رہی تھی کہ آپ سے مُلاقات ہو۔ عبادت صاحب نے آپ کا فون نمبر اور مکان کا پتہ معلوم کیا، اور ہم لوگ یہاں پہنچ گئے۔ دیرینہ آرزو پوری ہوئی۔"

خواجہ صاحب نے پوچھا "آپ آج کل سری نگر میں ہیں یا علی گڑھ میں؟"

سرور صاحب نے کہا "میں اب علی گڑھ میں ہوں۔ سری نگر کو خیرباد کہہ دیا ہے۔ کئی سال سے وہاں آنا جانا رہتا تھا۔ وقت بہت ضائع ہوتا تھا۔ جم کر کام کرنے کا موقع نہیں مِلتا تھا۔ اب علی گڑھ میں رہ کر ادھورے کاموں کو مکمل کر رہا ہوں۔"

علی گڑھ کا ذکر آتے ہی خواجہ صاحب خاصے جذباتی ہو گئے۔ اپنے زمانے کے علی گڑھ کو بہت یاد کیا۔ ایک ایک شخص کی خیریت معلوم کی۔ دیر تک علی گڑھ اور وہاں

کے مخصوص ماحول کی باتیں ہوتی رہیں۔

پھر خواجہ صاحب میری طرف متوجہ ہوئے۔ پوچھا "عبادت صاحب! آج کل کیا کام ہو رہا ہے"۔

میں نے کہا میں ادھر کچھ عرصے سے کلاسیکی اُردو شاعروں پر کام کر رہا ہوں۔ ادھر میر کی ایک ادبی سوانح جہان میر کے نام سے میں نے لکھی ہے جو شائع ہو چکی ہے۔ خواجہ میر دردؔ پر بھی ایک کتاب شائع ہوئی ہے۔ کچھ خاکے بھی لکھے ہیں۔ ان خاکوں کے تین مجموعے 'رہ نوردانِ شوق'، 'آوارگانِ عشق' اور 'جلوہ ہائے صد رنگ'، شائع ہو چکے ہیں۔ اِن کے علاوہ 'دیوان ولاؔ' بھی میں نے چھاپ دیا ہے۔ جلد یہ کتابیں آپ کی خدمت میں پیش کروں گا"۔

خواجہ صاحب کہنے لگے "یہ نہایت مفید کام ہے۔ میں ان کتابوں کا انتظار کروں گا"۔

پھر میں نے خواجہ صاحب سے پوچھا "آپ کی صحت کیسی ہے"؟

کہنے لگے "میں تو ٹھیک ہوں۔ صبح دوپہر اور شام کو خوب سیر کرتا ہوں۔ مٹرگشت میں وقت بھی اچھا گذر جاتا ہے، اور صحت بھی ٹھیک رہتی ہے۔ لیکن یہاں تنہائی بہت ہے۔ میری بیوی بیمار ہیں۔ اُن کی یادداشت ختم ہو گئی ہے۔ اِس کی وجہ سے پریشانی رہتی ہے"۔

غرض اس طرح کوئی ڈیڑھ دو گھنٹے تک ہم لوگ خواجہ صاحب کے ساتھ چائے پیتے اور باتیں کرتے رہے اُس کے بعد اُن سے اجازت لی۔

خواجہ صاحب نے بڑے ہی جذباتی انداز میں ہم لوگوں کو رُخصت کیا۔

میں اس کے بعد انقرہ یونیورسٹی کی پروفیسر شپ پر دو سال کے لئے تُرکی چلا گیا۔ وہاں مجھے ایک دن پاکستانی سفارت خانے میں یہ خبر ملی کہ مختصر علالت کے بعد خواجہ صاحب اللہ کو پیارے ہو گئے۔ بہت افسوس ہوا۔

خواجہ صاحب ایک ایسی تہذیب کی نشانی تھے جس کے نقوش اب دُھندلے ہوتے جاتے ہیں۔ اور پاکستانی معاشرے اور ماحول کے تیور یہ بتاتے ہیں کہ اب ایسے لوگ پیدا نہیں ہوں گے۔

اللہ تعالےٰ اُنہیں اپنے جوارِ رحمت میں جگہ دے اور اُن کے مقامات کو بلند کرے!

مولانا حامد علی خاں

مولانا حامد علی خاں اُردو کے نامور ادیب اور شاعر ہیں۔ تقریباً نصف صدی تک اُنہوں نے ادبی کام کیا ہے۔ ادبی مضامین لکھے ہیں۔ شاعری کی ہے، اور ہمایوں، الحمرا اور مخزن کے اڈیٹر کی حیثیت سے بے شمار نئے ادیبوں اور شاعروں کی تخلیقات کو شائع کر کے اُن کی حوصلہ افزائی کی ہے۔ اس لئے انہیں ایک ادیب گر کہا جائے تو بے جا نہیں۔ وہ اُردو زبان کے عاشق ہیں، اور اس زبان کے منّت پذیر شانہ گیسوؤں کو سنوارنے میں اُنہوں نے بڑے اہم کارنامے انجام دیئے ہیں ستائش کی تمنا اور صلے کی پروا کئے بغیر اُنہوں نے یہ کام کیا ہے۔ وہ ایک سچے، مخلص اور کھرے آدمی ہیں۔ اُنہیں ایک عظیم انسان کہا جائے تو بے جا نہیں۔

حامد علی خاں صاحب کا تعلق ایک ایسے خاندان سے ہے جو اپنی خوش اخلاقی، بلند کرداری، اخلاص مندی اور کھرے پن کے لئے مشہور ہے۔ وہ مولوی سراج الدین خاں صاحب کے فرزند ارجمند، اور مولانا ظفر علی خاں، پروفیسر محمود احمدؐ خاں اور پروفیسر حمید احمدؐ خاں کے بھائی ہیں۔ اُن کے والد اخبار زمیندار کے بانی تھے جس نے مولانا ظفر علی خاں کی ادارت میں صحافت کی گراں قدر خدمات انجام دیں۔ پروفیسر محمود احمدؐ خاں ایک زمانے تک عثمانیہ یونیورسٹی حیدرآباد دکن میں کیمسٹری کے پروفیسر رہے اور اُردو زبان میں

سائنس پڑھانے، اور سائنسی اصطلاحات وضع کرنے کے ایسے تجربات کئے جو اُردو زبان کے لئے مفید ثابت ہوئے۔ پروفیسر حمید احمدؐ خاں مرحوم انگریزی زبان و ادب کے پروفیسر، پنجاب یونیورسٹی کے وائس چانسلر اور اُردو کے نامور ادیب اور نقاد تھے۔ وہ اُردو کی حمایت میں ہمیشہ پیش پیش رہے۔

ایک ایسے علمی خاندان میں مولانا حامد علی خان صاحب نے آنکھ کھولی، اور انہوں نے بھی ساری زندگی علمی ادبی کاموں گذار دی۔ کرم آباد وزیر آباد اُن کا وطن تھا۔ اُن کی ابتدائی تعلیم وزیر آباد کے مشن اسکول میں ہوئی۔ وہ ڈاکٹر گریہم بیلی کے شاگرد تھے جو اُردو اور پنجابی بڑی روانی سے بولتے تھے۔ مولانا نے ان سے استفادہ کیا، اور پھر لاہور آ کر اپنی تعلیم جاری رکھی۔ انہوں نے یہاں سے بی۔ اے کیا اور کچھ عرصے تک اورینٹل کالج میں بھی تعلیم حاصل کی۔ اس زمانے میں انہوں نے اُردو زبان و ادب سے گہری دلچسپی کا اظہار کیا۔ مختلف اخباروں اور رسالوں میں مضامین لکھے اور اس طرح جلد ہی اُردو زبان و ادب میں اپنی جگہ بنالی۔

چنانچہ اُن کے اس ادبی مزاج کی وجہ سے میاں بشیر احمدؐ نے انہیں اپنے رسالے ہمایوں کا جوائنٹ اڈیٹر بنایا۔ تقریباً پندرہ سال تک وہ اس رسالے سے منسلک رہے، اور اُنہوں نے اسکے معیار کو بلند رکھنے میں نمایاں کردار ادا کیا۔ اس میں شائع ہونے والے مضامین کے ادبی معیار اور زبان کا خاص طور پر خیال رکھا، ان کو درست کر کے چھاپا جس کی وجہ سے ھمایوں' کا شمار اعلےٰ درجے کے ادبی رسالوں میں ہونے لگا۔ مولانا نے نوجوان ادیبوں کی ہمت افزائی بھی کی اور نئے ادیبوں کی تخلیقات کو ھمایوں' میں نہایت اہتمام کے ساتھ شائع کیا۔

دوسری جنگ عظیم کے زمانے میں اُن کا تقرر آل انڈیا ریڈیو دہلی میں ہوگیا۔ ن۔م۔ راشد اس زمانے میں دِلّی ریڈیو کے منتظم تھے۔ اُنہوں نے خاص طور پر ریڈیو پر نشر ہونے والی تحریروں کی زبان کو درست کرنے کا کام مولانا کے سپرد کیا، چنانچہ وہ ہمایوں کو چھوڑ کر لاہور سے دِلی آ گئے، اور کئی سال تک دِلّی ریڈیو کے ساتھ بطور مشیر زبان منسلک رہے۔

مولانا سے میرا غائبانہ تعارف تو رسالہ ھمایوں کے توسط سے ہو گیا تھا۔ اگست ۴۱ء میں جب فانی بدایونی کا انتقال ہوا تو میں نے اُن کے بارے میں ایک مضمون لکھ کر ھمایوں کے اڈیٹر کو بھیج دیا۔ مولانا نے مجھے فوراً مضمون کی رسید بھیجی۔ مضمون کی تعریف کی، اور اس کو اگست ۴۱ء کے شمارے میں نہایت اہتمام سے شائع کر دیا۔ حالانکہ اس مضمون میں کوئی خاص بات نہیں تھی۔ میں اس زمانے میں طالب علم تھا، اور یہ مضمون میری ایک طالب علمانہ کوشش تھی۔

دلّی کے دورانِ قیام میں مولانا سے میری پہلی مُلاقات ہوئی۔ میں اکثر تقریریں نشر کرنے کے لئے ریڈیو اسٹیشن جاتا تھا۔ ایک دن پہنچا تو ن۔م راشد صاحب مل گئے۔ وہ مولانا حامد علی خاں صاحب کے مدّاح تھے، اور انھوں نے ہی مولانا کو ریڈیو کی ملازمت کے لئے دلّی بُلایا تھا۔

راشد صاحب مجھے اپنے کمرے میں لے گئے۔ وہاں مولانا تشریف فرما تھے۔ راشد صاحب نے مجھ سے مخاطب ہو کر پوچھا "کیا آپ مولانا حامد علی خاں صاحب سے ملے ہیں؟"

میں نے کہا "ابھی تک اُن سے نیاز حاصل نہیں ہوا۔"

کہنے لگے "مولانا اس وقت یہاں موجود ہیں۔ ان سے ملئے۔"

یہ سُن کر مولانا اپنی جگہ سے اُٹھے اور مجھے گلے لگایا۔ اور پھر اپنے پاس مجھے صوفے پر بٹھایا اور میرا حال احوال پوچھا۔

میں نے کہا "مولانا ایک زمانے سے آپ کا نیاز حاصل کرنے کی خواہش دل میں مچل رہی تھی۔ شُکر ہے کہ آج یہ خواہش پوری ہوئی۔ اس کے لئے میں راشد صاحب کا شُکر گذار ہوں۔"

مولانا کہنے لگے "آپ سے غائبانہ تعارف تھا۔ آج آپ کو دیکھ کر اور مل کر جی خوش ہوا۔"

میں نے کہا "میں تو آپ کا ممنون احسان ہوں۔ چند سال ہوئے اپنی طالب علمی

کے زمانے میں میں نے فانی پر ایک مضمون لکھ کر بھیجا تھا۔ آپ نے بغیر کسی تاخیر کے اس کو ہُمایوں میں نہایت اہتمام سے شائع کر دیا۔ یہ میرا پہلا مضمون تھا جو ہُمایوں کے ایسے معیاری رسالے میں شائع ہوا"۔

مولانا کہنے لگے "آپ کا مضمون اچھا تھا اور اس کی ہُمایوں کو ضرورت بھی تھی۔ فانی بڑے اہم غزل گو شاعر تھے۔ اُن کے انتقال کی خبر سُنی تو میرے دل میں یہ خواہش پیدا ہوئی کہ اُن کے بارے میں ایک مضمون ہُمایوں میں شائع ہونا چاہیئے۔ آپ کے مضمون نے یہ خواہش پوری کر دی، اور میں نے ایک دو مضمون روک کر آپ کا مضمون اگست ۱۹۴۱ء کے شمارے میں شائع کر دیا۔ اور یہ مضمون شائع کر کے مجھے مسرّت ہوئی"۔

میں نے کہا "آپ کی نوازش تھی، ورنہ طالب علموں کے مضمون ہُمایوں کے ایک ایسے معیاری رسالے میں اتنے اہتمام سے بھلا کون چھاپتا ہے"۔

راشد صاحب ہماری یہ باتیں سنتے رہے۔ پھر اُنھوں نے مولانا سے میرا باقاعدہ تعارف کروایا، اور کہا "عبادت صاحب حال ہی میں لکھنؤ سے آئے ہیں۔ اینگلو عربک کالج میں اُردو زبان و ادب پڑھا رہے ہیں۔ ان کے مضامین نگار، ادب لطیف اور 'ادبی دُنیا' میں بھی شائع ہوئے ہیں۔ اپنے قبیلے کے آدمی ہیں۔ انھوں نے آزاد نظم کی حمایت میں بھی ایک مفصل مضمون لکھا ہے، اور نہایت مدلّل طریقے سے اس صنف کی اہمیت ذہن نشین کرائی ہے۔ اس مضمون کا اثر بہت اچھا ہوا ہے، اور قدامت پسندوں کی طرف سے اس صنف پر جو لے دے ہو رہی تھی، اُس کا زور اب خاصا کم ہو گیا ہے۔ ہمیں ان کا شکرگذار ہونا چاہیئے"۔

میں نے مولانا کو مخاطب کر کے کہا "اس مضمون کی تحریک راشد صاحب کی شاعری کی وجہ سے ہوئی۔ اُنھوں نے اپنی شاعری سے آزاد نظم کی اس صنف کو وقار دیا ہے اور اعتبار سے ہم کنار کیا ہے۔ میں اُن کے مجموعۂ کلام 'ماورا' کو دیکھ کر بہت متاثر ہوا۔ اس لئے میں نے سوچا کہ آزاد نظم پر ایک مفصل مضمون لکھوں جس میں اس صنف کی اہمیت واضح کی جائے"۔

مولانا نے کہا "میں نے یہ مضمون پڑھا ہے، اور مجھے اس کو پڑھ کر خوشی ہوئی ہے۔ آپ نے آزاد نظم کی حمایت اور وکالت بڑے سلیقے سے کی ہے اور راشد صاحب کی آزاد نظموں کا تجزیہ اس میں بڑی محبت اور جذب و شوق سے کیا ہے۔ آپ کا ایک مفصل مضمون "اُردو ادب ۱۹۴۲ء میں" بھی میں نے 'ادب لطیف' کے سالنامے میں پڑھا ہے۔ اس مضمون میں آپ نے اُردو ادب کا جائزہ بڑی محنت اور محبت سے لیا ہے"۔

غرض دیر تک میں مولانا حامد علی خاں اور راشد صاحب سے جدید ادب پر باتیں کرتا رہا۔ اس ملاقات نے مولانا کی شخصیت کے گہرے نقوش میرے دل پر ثبت کئے، اور میں اُن کی باتوں اور جدید ادب پر اُن کے خیالات و نظریات سے بہت متاثر ہوا۔

اس سے قبل میں نے مولانا کو دیکھا نہیں تھا۔ میرا خیال تھا کہ وہ مولانا کہلاتے ہیں۔ اس لئے وہ قدیم وضع قطع کے انسان ہوں گے، اُن کے چہرے پر داڑھی ہوگی اور وہ روایتی مشرقی لباس پہنتے ہوں گے۔

لیکن میں اُس دن مولانا کو دیکھ کر حیران رہ گیا۔ وہ مجھے بہت ہی وجیہ اور خوش شکل اور جامہ زیب نظر آئے۔ دراز قد، بھرا بھرا سڈول جسم سرخ سفید رنگ، کلین شیو، نہایت عمدہ قسم کے سوٹ میں ملبوس، مولانا کی شخصیت میں مجھے بڑی ہی دلکشی اور دلآویزی نظر آئی۔ ان کی آواز میں ایک عجب طرح کی شیرینی اور لہجے میں مخصوص قسم کا نیکھاپن تھا۔ باتیں کم کرتے تھے لیکن دوسروں کی باتوں پر مُسکراتے اور ہنستے تھے شگفتگی اور شادابی اُن کے ایک ایک انداز سے پھوٹی پڑتی تھی۔ بہت لئے دیئے رہتے تھے۔ نہایت سنجیدگی سے باتیں کرتے تھے، اور اُن کی باتوں میں وقار اور سنجیدگی کا رنگ و آہنگ نمایاں تھا۔

کوئی ایک گھنٹہ میں مولانا کے پاس بیٹھا اور اُن سے باتیں کرتا رہا۔ پھر اُن سے اجازت لی اور واپس اپنے کالج آیا۔ اس کے بعد اُن سے کئی ملاقاتیں ہوئیں، اور ان ملاقاتوں سے مجھ پر یہ بات واضح ہوئی کہ مولانا نہایت با اصول، سچے، کھرے، با اخلاق اور محبت والے انسان ہیں، اور نہایت صاف ستھری زندگی بسر کرتے ہیں۔ کم آمیزی

اُن کے مزاج میں ضرور تھی لیکن جن لوگوں سے ملتے تھے اُن سے بڑی محبت اور شفقت سے پیش آتے تھے۔ مجھ پر تو اُن کی شفقت اور محبت ہمیشہ بے پایاں رہی۔

اسی زمانے میں میراجی کو یہ خیال آیا کہ حلقۂ اربابِ ذوق کی شاخ دِلی میں بھی قائم کی جائے، اور جس طرح لاہور میں اس کے ہفتے وار اجلاس ہوتے ہیں، دِلّی میں بھی ویسے ہی اجلاس ہوں۔ میراجی بھی اُس زمانے میں دِلی ریڈیو میں ملازم تھے اور وہاں اچھا خاصا ادبی ماحول تھا۔ کیونکہ اُن کے ساتھ پطرس بخاری، مولانا حامد علی خاں، ن۔م۔ راشد، سعادت حسن منٹو، مختار صدیقی، اعجاز حسین بٹالوی، ضیاء جالندھری، کرشن چندر، پریم ناتھ در، اخلاق احمدؔ دہلوی وغیرہ بھی ریڈیو کے ساتھ منسلک تھے۔ اِن سب نے میراجی کی اس تجویز سے اتفاق کیا۔ میرے سُپرد میراجی نے یہ کام کیا کہ میں حلقے کے جلسوں کا انتظام اینگلو عربک کالج میں کروں۔ میں نے یہ فرض بہ خوشی انجام دیا۔ اس کے پہلے اجلاس کی صدارت میری درخواست پر مولانا حامد علی خاں صاحب نے کی۔ اس میں وہ تمام ادیب شریک ہوئے جن کا قیام اس زمانے میں دِلّی میں تھا۔

اس افتتاحی جلسے کی صدارت کے لئے مولانا ٹھیک چار بجے اینگلو عربک کالج میں تشریف لائے۔ میں نے اُن کا استقبال کیا۔ انہیں اپنے کمرے میں لے گیا۔ چائے سے اُن کی تواضع کی۔ اِدھر اُدھر کی باتیں کیں، اور پھر انہیں کالج ہال میں لے گیا جہاں ادیب جمع تھے۔ جلسہ صحیح وقت پر شروع ہوا۔ مولانا نے اس کی صدارت کی، اور اپنا افتتاحی خطبہ ارشاد فرمایا جس میں حلقہ ارباب ذوق کی اہمیت، اُردو زبان کی مقبولیت اور نئے ادبی رُجحانات کی آفاقیت پر روشنی ڈالی۔ اُن کا خطبہ نہایت فکر انگیز اور خیال افروز تھا۔ جس سے یہ اندازہ ہوا کہ مولانا اُردو زبان کے سچّے عاشق اور اُردو ادب کے جدید رُجحانات کے صحیح مزاج داں اور صحیح معنوں میں ایک ادبی انسان ہیں۔ مجھے یہ دیکھ کر بڑی مسرت ہوئی۔

مولانا اس کے بعد بھی حلقۂ ارباب ذوق دہلی کے جلسوں میں باقاعدگی سے شریک ہوئے، اور ہم سب نے ان سے استفادہ کیا اور اُن سے بہت کچھ سیکھا۔

یہ محفلیں تقریباً دو سال تک جاری رہیں لیکن جب قیام پاکستان کا اعلان ہوا تو دِلّی میں مسلمانوں کی تباہی و بربادی کی وجہ سے درہم برہم ہو گئیں۔ بیشتر ادیب پاکستان جانے کی تیاریاں کرنے لگے۔ دِلّی میں فسادات کی آگ بھڑکنے لگی، اور کشت و خون کا ایسا بازار گرم ہوا جس نے نادر و ابدالی کے قتل عام کی یاد تازہ کر دی۔ دِلّی کے مُسلمان لاہور اور کراچی جانے کے لئے رخت سفر باندھنے لگے۔

مولانا حامد علی خاں نے بھی لاہور جانے کی تیاری کی، لیکن فساد کے باوجود کئی روز تک ریڈیو اسٹیشن جا کر اپنی منصبی ذمہ داریوں کو پورا کیا۔ تمام امانتیں جو اُن کی تحویل میں تھیں، اُن کو متعلقہ افسروں کے حوالے کیا، اور کسی نہ کسی طرح دِلّی سے لاہور پہنچ گئے۔

قیام پاکستان کے بعد لاہور میں مولانا نے کوئی ملازمت نہیں کی۔ روزنامہ امروز میں کچھ عرصے کام ضرور کیا لیکن جلد ہی وہ اس ماحول سے بیزار ہو گئے۔ کیونکہ وہاں آپس میں جھگڑے بہت تھے۔ اس زمانے میں مولانا صلاح الدین کے ساتھ ان کا رابطہ رہا جو اُن دنوں 'ادبی دُنیا' نکالتے تھے۔ اس زمانے میں مولانا کا زیادہ وقت 'ادبی دُنیا' کے دفتر میں گذرتا تھا، اور وہ اکثر لاہور کی سڑکوں پر مولانا صلاح الدین احمدؒ کے ساتھ نظر آتے تھے۔ اُن کے ساتھ وہ کبھی کبھی ادبی جلسوں میں بھی چلے جاتے تھے۔ مولانا صلاح الدین احمدؒ کے ساتھ ان کو ذہنی مناسبت تھی۔ اس کا سب سے بڑا سبب یہ تھا کہ دونوں اُردو زبان و ادب کے شیدائی تھے۔ مولانا صلاح الدین نے "اُردو پڑھو، اُردو بولو، اُردو لکھو" کی جو تحریک چلائی تھی، اُس سے مولانا حامد علی خاں کو پوری طرح اتفاق تھا۔ وہ اس تحریک کے سرگرم کارکن تھے۔ اُنہوں نے اپنے فکر و عمل سے اس تحریک کو بہت تقویت پہنچائی۔ مولانا کئی زبانیں جانتے تھے۔ انگریزی، عربی، فارسی پر انہیں قدرت حاصل تھی، لیکن وہ سوائے اُردو کے کبھی کوئی اور زبان نہیں بولتے تھے۔ اُن کی مادری زبان پنجابی تھی لیکن وہ اُردو کو اپنی مادری زبان سمجھتے تھے، اور ہمیشہ ہر ایک سے اسی زبان میں باتیں کرتے تھے۔ اُن کا خیال تھا کہ پنجابی اور اُردو دونوں میں کوئی فرق نہیں ہے۔ وہ ایک ہی زبان کے دو روپ ہیں۔

اورینٹل کالج اُس زمانے میں صرف ایک تدریسی ادارہ ہی نہیں تھا، اُس کی حیثیت

ایک ادبی مرکز کی بھی ہوگئی تھی۔ اس ادارے میں اُس وقت میرے ساتھ ڈاکٹر سید عبداللہ، ڈاکٹر ابواللیث صدیقی اور پروفیسر سید وقار عظیم صاحب بھی تھے۔ شہر کے نامور ادیب اورینٹل کالج میں آتے رہتے تھے۔ تقریباً روزانہ کوئی نہ کوئی ادبی جلسہ ہوتا رہتا تھا۔ مولانا ہماری دعوت پر ان جلسوں میں شرکت کرتے تھے، اور اپنی دلچسپ اور خیال انگیز باتوں سے علم و ادب کے موتی بکھیرتے تھے۔ اُس زمانے میں جو جلسے اورینٹل کالج میں ہوتے تھے، اُن میں سے بیشتر کی صدارت یا تو مولانا صلاح الدین احمدؒ کرتے تھے یا مولانا حامد علی خاں۔

مولانا حامد علی خاں بنیادی طور پر ادبی آدمی تھے۔ ادب اُن کا اوڑھنا بچھونا تھا۔ اس لئے اُنہوں نے اپنے ذوق ادب کی تسکین کے لئے پہلے تو رسالہ مخزن کی ادارت قبول کی، اور کئی سال تک یہ رسالہ مولانا حامد علی خاں کی ادارت میں نہایت سلیقے سے شائع ہوتا رہا، اور جب وہ بند ہوگیا تو مولانا نے اپنا رسالہ "الحمراء" کے نام سے نکالنا شروع کیا۔ کئی سال تک وہ اس رسالے کو نکالتے رہے، اور اس میں اعلےٰ معیار کی صاف ستھری تحریریں شائع ہوتی رہیں۔ لیکن اُردو کے رسالے عام طور پر بند ہونے کے لئے نکالے جاتے ہیں کیونکہ اکثر نقصان پر چلتے ہیں۔ مولانا کا رسالہ الحمرا بھی چند سال کے بعد بند ہو گیا۔ بہر حال اس رسالے کی چند سال کی فائلیں اس بات کی گواہ ہیں کہ مولانا نے اُس میں اعلےٰ درجے کا ادب شائع کیا، اور ادب دوستوں کے لئے اُن کے ادبی ذوق کی تسکین کا خاصا سامان فراہم کیا۔

قیامِ پاکستان کے بعد لاہور کے دورانِ قیام میں مولانا کچھ عرصے کے لئے ایک امریکی ادارے فرینکلن سے بھی وابستہ رہے۔ اس ادارے کی ملازمت کو بھی اُنہوں نے ادبی خدمت کے طور پر قبول کیا۔ کئی سال وہ اس ادارے میں رہے اور انہوں نے اس زمانے میں امریکی کتابوں کے تراجم بڑے سلیقے سے شائع کئے جس کی وجہ سے اس ادارے نے طباعت و اشاعت کی دُنیا میں بڑا نام پیدا کیا۔ مولانا نے اس ملازمت کو اُردو زبان اور ادب کی خدمت کے خیال سے قبول کیا، اور اپنی خداداد صلاحیتوں، سے اُردو زبان و ادب کی گراں قدر خدمات انجام دیں۔ مُختلف علمی موضوعات پر اہم کتابوں کو

شائع کیا جس سے اُردو زبان میں گراں قدر اضافے ہوئے۔

اس زمانے میں مولانا اکثر اورینٹل کالج میں تشریف لاتے تھے۔ اس ادارے کے علمی ادبی کاموں میں دلچسپی لیتے تھے۔ اور مجھے از راہ نوازش خاصا وقت عنایت فرماتے تھے۔ اس زمانے میں اورینٹل کالج ایک اہم ادبی مرکز بن گیا تھا۔ تقریباً روزانہ یہاں ادبی جلسے ہوتے تھے۔ ہر ہفتے شعر و شاعری کی محفلیں ہوتی تھیں۔ مولانا ان جلسوں میں مولانا صلاح الدین احمدؒ کے ساتھ باقاعدگی سے شریک ہوتے تھے، اور اپنی کم سُخنی اور کم آمیزی کے باوجود علم و دانش کے موتی بکھیرتے تھے۔

مولانا حامد علی خاں کے مزاج میں کم آمیزی تھی۔ بہت کم لوگوں سے ملتے تھے۔ لیکن ادبی مزاج رکھنے والے لوگوں سے بڑی شفقت اور محبت سے پیش آتے تھے۔ اورینٹل کالج کے اساتذہ کے علمی ادبی کاموں سے انہیں گہری دلچسپی تھی۔ شاید اس کی وجہ یہ تھی کہ وہ اورینٹل کالج کے طالب علم رہ چکے تھے، اور اس ادارے میں رہ کر انہوں نے مشرقی علوم کے کئی امتحانات پاس کئے تھے۔ اکثر جب وہ کالج میں تشریف لاتے تھے تو اساتذہ کے علمی ادبی کاموں کے بارے میں معلومات حاصل کرتے تھے، اور اس ادارے میں جو علمی اور تحقیقی کام ہو رہا تھا، اُس کی تعریف کرتے تھے۔ اُن کا مزاج علمی تھا، اور وہ ایک ادبی انسان تھے۔

اُنھوں نے ساری زندگی ادبی کام کیا۔ اعلیٰ درجے کی شاعری کی۔ خوبصورت نثر لکھی۔ بلند پایہ ادبی مضامین لکھے۔ ھمایوں، ادبی دُنیا، مخزن اور اُردو کے دوسرے رسالے اس کے گواہ ہیں۔ مولانا کے مزاج میں بڑے ادیبوں کی طرح ایک عجب قسم کی بے نیازی تھی۔ اُنھوں نے اپنی تحریروں کو کبھی یک جا نہیں کیا۔ لیکن وہ رسالوں کی پُرانی فائلوں میں محفوظ ہیں۔ ان تحریروں کو یک جا کر کے کتابی صورت میں شائع کرنے کی ضرورت ہے۔ کیونکہ یہ شعری اور نثری تحریریں اُردو کے جدید ادب میں ایک اضافے کی حیثیت رکھتی ہیں۔ ان تحریروں میں پختگی ہے، شگفتگی اور شادابی ہے۔ یہ جدید رنگ و آہنگ سے مالا مال ہیں، اور ان میں جو پہلو دار کیفیت ہے، وہ ادب و شعر سے ہر دلچسپی لینے والے کے دامن

دل کو اپنی طرف کھینچتی ہے۔

دِلّی اور لاہور کے دورانِ قیام میں مولانا کی شفقت مجھ پر بے پایاں رہی۔ وہ ہمیشہ میرا خیال رکھتے تھے اور مجھے مفید مشورے دیتے تھے۔ میرے کاموں کو ہمیشہ سراہتے تھے اور اس طرح میری حوصلہ افزائی ہوتی تھی۔ مولانا حامد علی خاں صاحب، اُن کے بھائی پروفیسر محمود احمدؒ خاں صاحب مرحوم اور پروفیسر حمید احمدؒ خاں صاحب کا تعاون بھی مجھے ہمیشہ حاصل رہا، اور وہ ہمیشہ مجھ پر شفقت فرماتے اور میری رہنمائی کرتے رہے۔ اُن کی شفقت اور محبت کی وجہ سے میں اپنی منزل کی طرف گام زن رہا، اور مجھے اس حیات مستعار میں اُن منزلوں سے ہم کنار ہونے کے مواقع مِلے جو میرے پیشِ نظر تھیں۔

اورینٹل کالج کے پرنسپل کی حیثیت سے اس کالج کا جشن صد سالہ منانے کے لئے پنجاب یونیورسٹی نے مجھے جو ذمہ داری سونپی تھی، وہ میرے لئے ایک بہت بڑی آزمائش تھی۔ مزاج کے اعتبار سے میں ایک مثالیت پسند اور آئیڈلسٹ ہوں۔ اپنے اس مزاج کی وجہ سے میں نے جشن صد سالہ منانے کے کام کو بہت پھیلا لیا تھا۔ اورینٹل کالج میگزین کے جشن صد سالہ نمبروں کی ترتیب و تزئین، اورینٹل کالج کے پُرانے اور نئے اساتذہ کے علمی کاموں کی از سر نو طباعت و اشاعت، اُن کی نمائش، بڑے پروفیسروں اور اسکالروں کے لیکچروں کا انتظام اور دُنیا کے مختلف ممالک کے ماہرین علوم مشرقی کی بین الاقوامی کانگریس کے جلسوں کا اہتمام، تنہا میرے ایسے نحیف و نزار شخص کے بس کی بات نہیں تھی۔ اِن کاموں میں مجھے اپنے بعض رفقائے کار اور شاگردوں کے ساتھ مولانا حامد علی خاں اور اُن کے برادران گرامی قدر پروفیسر محمود احمدؒ خاں اور پروفیسر حمید احمدؒ خاں کا تعاون حاصل رہا، اور یہ تمام کام نہایت خوش اسلوبی سے انجام پائے۔ ماہرین علوم مشرقی کی بین الاقوامی کانگریس کے جلسے ایک ہفتے تک جاری رہے، اور ان میں دُنیا کے تقریباً تمام اہم ملکوں کے اسکالروں، پروفیسروں، دانش وروں اور ادیبوں نے شرکت کی۔ بڑی بات یہ ہے کہ یہ لوگ اپنی یونیورسٹیوں اور تحقیقی اداروں کے خرچ پر لاہور آئے، اور اُنہوں نے کانگریس کے مختلف اجلاسوں میں اپنے علمی مقالے پڑھے

اور اس طرح اورینٹل کالج کو خراج تحسین پیش کیا۔ میرے لئے تو یہ بہت بڑی کامیابی تھی۔
اس کامیابی کو کچھ اوچھے قسم کے لوگ اور نادان دوست برداشت نہ کر سکے۔
رشک و حسد نے ان لوگوں کو ہمارے خلاف باتیں کرنے اور منفی قسم کے مضامین لکھنے پر مجبور کیا۔ جو بعض گھٹیا قسم کے اخباروں میں شائع ہوئے۔ یہ اور بات ہے کہ اس کا اثر اُلٹا ہوا۔ لیکن بہرحال اس کی وجہ سے میری طبیعت بدمزہ ہوئی، اور میں غم و غصہ کا شکار رہا۔
مولانا حامد علی خاں صاحب نے میری اس کیفیت کو شدّت کے ساتھ محسوس کیا۔
ایک دن بہ نفس نفیس کالج میں تشریف لائے، اور میرے کمرے میں داخل ہو کر کہا
عبادت صاحب! زندہ باد! — آپ ان منفی باتوں سے اپنے دل کو میلا نہ کیجئے۔ اورینٹل کالج کا جشن صدسالہ منا کر آپ نے ایک ایسا کارنامہ انجام دیا ہے جو اورینٹل کالج، پنجاب یونیورسٹی اور پاکستان کی تعلیمی، علمی اور تہذیبی تاریخ میں ہمیشہ یادگار رہے گا۔ آپ نے تو ایک کارنامہ دے دیا۔ ایک ہفتے تک ماہرین علوم مشرقی کی کانگریس کے جلسے کرنا، ان جلسوں میں امریکہ، روس، چین، برطانیہ، جرمنی، چیکوسلوویکیا، مصر، شام، ایران اور افغانستان کے بڑے بڑے پروفیسروں اور ادیبوں کو جمع کرنا، اُن سے تحقیقی مقالے پڑھوانا، اور اور ان تمام مقالوں کو جمع کر کے ایک خوبصورت کتاب میں چھاپ دینا آپ ہی کا کام تھا۔
اب کوئی سو سال تک مزید زندہ رہے گا تو یہ سوچے گا کہ اورینٹل کالج کا جشن صدسالہ اس طرح منائے —— اور ظاہر ہے کہ یہ ممکن نہیں"۔ آج میں یہی بات کہنے کے لئے خاص طور پر آیا ہوں"۔
اور مولانا کی یہ باتیں سُن کر میرا کسل دور ہو گیا۔ مولانا کے میرے پاس آنے اور اس قسم کی باتیں کرنے کا مقصد بھی یہی تھا۔
مولانا کی شفقت اور محبت میری زندگی کا بہت بڑا سرمایہ ہے۔ اللہ تعالےٰ انہیں عمر خضر عطا فرمائے! میں اُن کے لئے ہر وقت یہی دُعا کرتا ہوں، اور بار بار

اُن کا یہ پہلو دار شعر پڑھ کر اس کی معنویت سے لُطف اندوز ہوتا ہوں ؎

گُلزار کے سایوں میں وہی حشر بپا ہے
پھولوں سے ابھی تک تری خوشبو نہیں جاتی

پروفیسر ڈاکٹر محمد باقر

قیام پاکستان سے قبل ڈاکٹر محمدؐ باقر دہلی کے محکمۂ تعلیم میں ڈائرکٹر تھے۔ دوسری جنگِ عظیم کے زمانے میں وہ کچھ عرصے کے لئے ہندوستان کی فضائیہ میں افسر تعلقات عامہ بھی رہ چکے تھے۔ پاکستان کا قیام عمل میں آیا، تو وہ دلّی سے لاہور آ گئے اور اورینٹل کالج لاہور میں اُنہیں فارسی کی ریڈر شپ مِل گئی، اور پھر وہ ریٹائرمنٹ تک اسی کالج میں رہے۔ اورینٹل کالج کے دورانِ قیام میں انہیں فارسی کی پروفیسر شپ، شعبۂ فارسی کی صدارت، اور اورینٹل کالج کی پرنسپلی کا اعزاز بھی مِلا۔ اسی حیثیت سے وہ ۱۹۷۰ء میں اس کالج سے ریٹائر ہوئے۔

میں جب قیام پاکستان کے بعد اورینٹل کالج کے شعبۂ اُردو میں آیا تو میں اُن سے میری پہلی ملاقات ہوئی۔ ایک دن میں صبح کو اپنے کمرے میں بیٹھا ہوا کسی کام میں مصروف تھا کہ ایک صاحب نہایت خوش شکل، سرخ سفید رنگ، بھرا بھرا جسم، میانہ قد، سفید بش شرٹ اور پتلون میں ملبوس، پاؤں میں مُلتانی انداز کا کام دار جوتا، کلائی میں طلائی زنجیر کی سُنہری گھڑی، جیب میں سُنہرے رنگ کے دو عدد پارکر قلم، گرج دار آواز، صحت مند، ہشاش بشاش، میرے کمرے میں بے تکلفی سے داخل ہوئے، اور کہا "میرا نام ڈاکٹر محمدؐ باقر ہے۔ میں اورینٹل کالج میں فارسی کا ریڈر ہوں۔"

یہ سُن کر میں کھڑا ہو گیا۔ اُن کا استقبال کیا۔ معانقہ کیا، اور کہا "بسم اللہ! زہے نصیب، خوش آمدید، تشریف رکھیئے"۔

ڈاکٹر باقر کہنے لگے "میں دو دن سے آپ سے ملنے کی کوشش کر رہا ہوں۔ لیکن جب بھی معلوم کیا تو پتہ چلا کہ آپ موجود نہیں ہیں۔ اسی لئے تاخیر سے مُلاقات ہو رہی ہے"۔

میں نے کہا "ابھی مجھے لاہور آئے صرف تین دن ہوئے ہیں۔ مصروف اور پریشان رہا۔ اسی لئے آپ کی خدمت میں حاضر نہ ہو سکا۔ معذرت خواہ ہوں"۔

باقر صاحب نے کہا "مجھے احساس تھا کہ آپ ابھی نئے نئے آئے ہیں۔ مصروف ہوں گے۔ ایسے مسائل کا بھی سامنا ہو گا جن سے ہر وہ شخص دوچار ہوتا ہے جو نئی جگہ پر آتا ہے"۔

ڈاکٹر محمدؐ باقر تقریباً آدھ گھنٹہ میرے پاس بیٹھے۔ اِدھر اُدھر کی باتیں کیں، اور رخصت ہوئے تو کہا کہ "میرے لائق کوئی خدمت ہو تو بے تکلفی سے مجھے بتایئے۔ میں ہر خدمت کے لئے حاضر ہوں۔ مجھے اپنا بڑا بھائی سمجھئے، اور کوئی مسئلہ تو مجھے بتایئے۔ انشاء اللہ یہ مسئلہ حل ہو جائے گا"۔

باقر صاحب کی باتوں میں بڑی محبت تھی۔ میں اُن سے پہلی ہی مُلاقات میں بہت متاثر ہوا، اور اُس دن سے لے کر اُن کے ریٹائرمنٹ کے وقت تک تقریباً بیس پچیس سال اُن سے میری دوستی رہی۔ اُنھوں نے ہمیشہ میرا خیال رکھا، اور ہر مرحلے پر میری مدد کی۔ وہ ہمیشہ میرے محسن رہے۔ میں اُن کی شفقت اور محبت کو کبھی بھلا نہیں سکتا۔

یہ زمانہ اورینٹل کالج میں خاصے انتشار کا زمانہ تھا۔ قیام پاکستان کے بعد اب اس کی تنظیم نو ہو رہی تھی۔ نہ تو کسی شعبے میں کوئی پروفیسر تھا، نہ کوئی مستقل پرنسپل۔ پُرانے ہندو سکھ پروفیسر ہندوستان جا چکے تھے۔ فارسی کے نامور پروفیسر محمدؐ اقبال صاحب کا انتقال ہو چکا تھا۔ اُنہیں کی جگہ پر ڈاکٹر باقر ریڈر اور صدر شعبہ مقرر کئے گئے تھے۔ اُردو کا شعبہ نیا نیا قائم ہوا تھا، اور ڈاکٹر عبداللہ ریڈر ہونے کی حیثیت سے اس کے صدر بنا دیئے گئے تھے۔ ڈاکٹر ابواللیث صدیقی اور وقار عظیم صاحب اس شعبے میں آ گئے تھے، اور اس طرح لکھنے پڑھنے اور درس و تدریس کی صحیح فضا پیدا ہو گئی تھی۔

ہم لوگ گیارہ بجے کے قریب کالج کی دوسری منزل کے اس کمرے میں جمع ہوتے اور چائے پیتے تھے۔ جو تقسیم سے قبل پروفیسر سنسکرت کے پروفیسر ڈاکٹر لکشمن سروپ کا کمرہ تھا۔ ڈاکٹر باقر بھی ہمارے ساتھ شریک ہو جاتے تھے۔ اچھا وقت گذرتا تھا۔ ہم لوگ چائے پیتے، باتیں کرتے اور مستقبل کے لئے کام کے منصوبے بناتے تھے۔

ڈاکٹر محمد باقر اُستاد تو فارسی کے تھے لیکن علمی ادبی کام اُردو زبان وادب میں کرتے تھے۔ لندن یونیورسٹی سے اُنھوں نے اُردو فارسی کے کسی مشترک موضوع پر پی ایچ ڈی کی ڈگری حاصل کی تھی، اور اس سلسلے میں کئی سال لندن میں گذارے تھے۔ پی ایچ ڈی کے لئے اُنھوں نے اُردو کے مشہور پروفیسر ڈاکٹر گراہم بیلی کی نگرانی میں کام کیا تھا باقر صاحب اُن کے خاص شاگردوں میں تھے۔ لندن سے وہ نہایت دلچسپ خطوط لکھتے تھے جو 'ہمایوں' اور 'ادبی دنیا' میں شائع ہوتے تھے۔ نسیم رضوانی کے نام سے اُنھوں نے پنجاب کی اُردو شاعری پر ایک کتاب بھی لکھی تھی۔ جو شعرائے پنجاب کے نام سے شائع ہوئی تھی۔ آخری تاجدار اودھ نواب واجد علی شاہ کے کچھ نادر و نایاب خطوط بھی انھوں نے "تاریخ ممتاز" کے نام سے شائع کئے تھے۔ لاہور کی تاریخ بھی انھوں نے انگریزی میں لکھی تھی۔ اس ضخیم کتاب کو پنجاب یونیورسٹی نے نہایت اہتمام سے شائع کیا تھا۔ قدیم اُردو پر بھی اُنھوں نے خاصی تعداد میں مضامین لکھے تھے۔ ان کاموں کی وجہ سے علم وادب کی دُنیا میں اُن کی خاصی شہرت تھی، اور میں اُن کے ادبی کام سے خاصا مُتاثر تھا۔

ڈاکٹر باقر صاحب اُس زمانے میں ماڈل ٹاؤن میں رہتے تھے۔ بارہ کنال کی وسیع و عریض کوٹھی میں اُن کا قیام تھا۔ اُن کی لائبریری بھی اس کوٹھی میں تھی۔ میں اکثر اُن کے ہاں جاتا تھا، اور وہ بڑی محبت سے پیش آتے تھے۔ کام کرنے کے لئے اپنی کتابیں بھی مجھے دیتے تھے۔ خاطر مدارات بھی بہت کرتے تھے۔ اُن کی اِس شفقت اور محبت کی وجہ سے روز بہ روز میں اُن سے زیادہ قریب ہوتا گیا۔

میں اس زمانے میں بے گھر تھا۔ کئی کوٹھیاں یکے بعد دیگرے میرے نام الاٹ ہوئی تھیں لیکن میں اُن سے فائدہ نہ اُٹھا سکا۔ کیونکہ جو کوٹھی بھی الاٹ ہوتی تھی، اُس میں مہاجر بیٹھے

تھے۔ اُن کا یہ قبضہ غاصبانہ اور غیر قانونی تھا۔ اس لئے محکمۂ بحالیات کے ارباب اختیار یہ کہتے تھے کہ اُن کو پولیس کے ذریعے سے نکالیئے، اور خود کوٹھی میں داخل ہو جائیے۔ لیکن یہ میرے بس کی بات نہیں تھی۔ کیونکہ میں ظالم اور سفاک نہیں تھا۔ یہ بات میرے خواب و خیال میں بھی نہیں آ سکتی تھی کہ لٹے پٹے لوگوں کو جائے پناہ سے باہر نکال کر میں اس پر قبضہ جماؤں اور چین آرام کی زندگی بسر کروں۔

اس لئے میں نے یہ فیصلہ کیا کہ میں ہندوؤں کے چھوڑے ہوئے مکان میں نہیں رہوں گا۔ لاہور میں جو نئی آبادیاں تعمیر ہو رہی ہیں، اُن میں کوئی کوارٹر لے لوں گا۔ چنانچہ میں اس وقت کے لاہور امپرومنٹ ٹرسٹ کے سربراہ اور لاہور کے ڈپٹی کمشنر ظفر الاحسن صاحب مرحوم کے پاس گیا۔ انہیں اپنی روداد غم سُنائی، اور اُنہوں نے سمن آباد کی نئی آبادی میں ایک کوارٹر میرے نام الاٹ کرنے کا وعدہ کر لیا۔ لیکن میرے پاس پیسے نہیں تھے اس لئے میں بروقت مطلوبہ رقم ٹرسٹ میں جمع نہ کروا سکا۔ پھر جب رقم کا انتظام ہو گیا تو جمع کرنے کی آخری تاریخ گذر گئی، اور میں مایوس ہو کر یہ سوچنے لگا کہ اب اس شہر میں مکان کا ملنا مشکل ہے۔ اس زمانے میں سید محمد جعفری۔ کا یہ شعر میری زبان پر رہتا تھا ؎

لاہور میں نہیں ہے رہنے کا اب ٹھکانا
چین و عرب ہمارا ہندوستاں ہمارا

ایک دن میں نے ڈاکٹر باقر صاحب سے اِس صورت حال کا ذکر کیا تو وہ فوراً بولے "تم بالکل فکر نہ کرو۔ میں یہ کام کروں گا۔ ظفر الاحسن صاحب سے مِلوں گا۔ پروفیسر دل کی حالت زار سے انہیں آگاہ کروں گا۔ رقم جمع ہو جائے گی، اور مکان تمہیں مِل جائے گا۔" میں نے کہا "اندھا کیا چاہے دو آنکھیں۔ آپ کے توسط سے اگر یہ کام ہو گیا تو میں زندگی بھر آپ کا یہ احسان نہیں بھولوں گا۔"

دوسرے دن باقر صاحب کو میں نے مطلوبہ رقم کا چیک دیا۔ وہ یہ چیک لے کر لاہور امپرومنٹ ٹرسٹ کے دفتر گئے۔ ظفر الاحسن صاحب سے مِلے۔ میری وکالت کی اور

کامیاب وکامران وہاں سے واپس آئے۔ مجھے خوش خبری سنائی اور اس طرح سمن آباد کی نئی آبادی میں مجھے وہ مکان مِل گیا جس میں میرے خاندان والے تقریباً پندرہ بیس سال رہے، اور اس میں اب میری لائبریری اور دفتر ہے، اور میں دن بھر اس میں بیٹھ کر اپنا علمی ادبی کام کرتا ہوں۔

ڈاکٹر باقر صاحب کے اس احسان کو میں زندگی بھر نہیں بھول سکتا۔ اُن کی شفقت اور محبت نے مجھے لاہور میں سر چھپانے کی جگہ دلائی اور مجھے اس شہر میں صاحب جائیداد بنا دیا۔

باقر صاحب دوستوں کے دوست تھے، اور اس طرح کے کام کرنے کے لئے ہمیشہ تیار رہتے تھے۔ میں نے کبھی اُن کی زبان سے یہ کہتے ہوئے نہیں سُنا کہ یہ کام نہیں ہو سکتا۔ دوستوں کی تو خیر الگ بات ہے، کوئی اجنبی بھی اُن کے پاس آتا تھا، اور کسی کام کے لئے کہتا تھا تو وہ اُس کی بھی مدد کرتے تھے۔ بعض غلط قسم کے لوگ بھی اُن کے اس مُثبت رویّے سے فائدہ اُٹھاتے تھے اور بعض ایسے کام بھی اُن سے کروا لیتے تھے جن کا کرنا مناسب نہیں ہے۔ اُن کی نیکی، شرافت، معصومیت اور سادہ لوحی کسی کو اُن کے دروازے سے مایوس اور ناکام واپس نہیں جانے دیتی تھی۔

میرے کہنے سے تو انہوں نے اپنے شعبے میں بعض ایسے لوگوں کے تقرر بھی کر لئے جو آگے چل کر اچھے لوگ ثابت نہیں ہوئے، اور جن کی نادانی، کم فہمی اور اوچھے پن کی وجہ سے مجھے اور انہیں دونوں کو خاصی اُلجھنوں کا سامنا کرنا پڑا۔

پروفیسر سیّد وزیر الحسن عابدی صاحب سے اُن کے تعلقات کو انہیں لوگوں نے خراب کیا، اور اس کی وجہ سے عابدی صاحب مرحوم کو جو پریشانی ہوئی سو ہوئی، شعبۂ فارسی کا ماحول جہنّم سے بدتر ہو گیا۔ باقر صاحب سادہ آدمی تھے۔ ان سازشوں کی تہہ تک پہنچ نہ سکے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ شعبے کا مسموم ماحول اُن کے لئے خاصی ذہنی کوفت اور پریشانی کا باعث بنا۔

ڈاکٹر باقر صاحب کو سیاست نہیں آتی تھی۔ وہ سازش کرنا نہیں جانتے تھے۔

اس لئے یونیورسٹی کی سیاست میں انہیں کبھی کوئی مقام حاصل نہ ہوسکا۔ حالانکہ اپنے منصب کے اعتبار سے انہیں یہ مقام حاصل ہونا چاہیئے تھا۔ وہ عرصہ دراز تک فارسی کے پروفیسر، شعبۂ فارسی کے صدر، اور اورینٹل کالج کے پرنسپل رہے لیکن سنڈیکیٹ کے ممبر کبھی نہ ہوسکے۔ سینٹ اور کمیٹی فار ہائر اسٹڈیز اور کئی دوسری کمیٹیوں کے وہ اِکس آفیشو EX - OFFICIO ممبر رہے لیکن کسی اہم کمیٹی کے لئے انہوں نے کبھی انتخاب نہیں لڑا۔ کیونکہ اس کے لئے جوڑ توڑ کی ضرورت ہوتی تھی، اور یہ کام ڈاکٹر باقر صاحب کو نہیں آتا تھا۔ اُن کے بعض ہم عصر اور رفقائے کار اس معاملے میں اُن سے سبقت لے گئے۔ اس لئے کہ وہ سیاست گری اور جوڑ توڑ میں اپنا جواب نہیں رکھتے تھے۔ ان لوگوں نے اپنی سازشوں سے ڈاکٹر باقر صاحب کو اس حد تک فرسٹریشن کا شکار کر دیا تھا کہ ایک دفعہ یونیورسٹی کی کسی باڈی کے لئے الکشن ہونے والا تھا۔ اس کے لئے کسی نے باقر صاحب کا نام تجویز نہیں کیا تو اُنھوں نے اپنی زوردار آواز میں کہا "جناب صدر! میں اس کے لئے اپنا نام خود تجویز کرتا ہوں"۔ دوسری طرف سے کسی کی آواز آئی "میں اس کی تائید کرتا ہوں"۔ اس طرح وہ منتخب ہوگئے۔ اس واقعہ سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ وہ کیسی ذہنی اذیت میں مُبتلا تھے۔

اس میں کوئی شُبہ نہیں کہ ڈاکٹر باقر صاحب کو دفتری کام میں مہارت حاصل تھی۔ اس شعبے میں اُن کا تجربہ بہت تھا۔ اورینٹل کالج میں آنے سے قبل وہ ایسے شعبوں میں خاصے عرصے تک کام کر چکے تھے جہاں دفتری کام کو بُنیادی حیثیت حاصل تھی۔ اس تجربے سے انہیں بہت فائدہ ہوا۔ انہوں نے اورینٹل کالج کے شعبۂ فارسی کو بڑے سلیقے سے چلایا اور اُن کی صدارت کے زمانے میں یہ شعبہ خاصی ترقی سے ہم کنار ہوا۔ اُن کی نگرانی میں علمی اور تحقیقی کام بھی ہوا، اور ایران کیساتھ ثقافتی تعلقات بھی مضبوط بنیادوں پر استوار ہوئے۔ چنانچہ اُن کی کوششوں سے حکومت ایران کی طرف سے ایک وزیٹنگ پروفیسر اورینٹل کالج کے شعبۂ فارسی میں مقرر کیا گیا جس سے شعبے نے برسوں تک استفادہ کیا۔ ایران کے ساتھ پروفیسروں اور دانشوروں کے تبادلے ہوئے۔ مشہور و معروف ایرانی پروفیسر

اورینٹل کالج میں آئے، اور ڈاکٹر باقر صاحب کی سربراہی میں کئی دفعہ پاکستان کے وفد ایران گئے۔ حکومت ایران کی طرف سے ڈاکٹر باقر صاحب کو نشانِ سپاس کا اعزاز بھی دیا گیا۔ یہ درحقیقت اُن کی گراں قدر خدمات کا اعتراف تھا۔

دُنیا کی تقریباً تمام اہم یونیورسٹیوں کے ارباب اختیار سے ڈاکٹر باقر صاحب کے تعلقات تھے، اور ان تعلقات ہی کی بدولت وہ بیرونی مُلکوں میں پہچانے جاتے تھے انھوں نے اورینٹل کالج کے دوران قیام میں جو علمی اور تحقیقی کام کیا تھا، اُس کی وجہ سے بیرونی ممالک میں اُن کی بڑی عزّت تھی۔ اِسی کام کی وجہ سے اُنھوں نے ایران، عراق، انگلستان، جرمنی اور فرانس میں منعقد ہونے والی کئی بین الاقوامی کانفرنسوں میں شرکت کی، اور اس سے فائدہ اُٹھا کر انھوں نے بعض ایسے ممالک کی سیاحت بھی کی جہاں ایک پاکستانی دانشور کا جانا جوئے شیر کے لانے سے کم نہیں۔ یعنی وہ روس اور اسرائیل اور مشرقی جرمنی بھی گئے۔ ایک سال تک وہ نیویارک کی بفیلو یونیورسٹی میں وزٹنگ پروفیسر بھی رہے، اور امریکہ کی مشہور یونیورسٹیوں میں اُنھوں نے لیکچر بھی دیئے۔

ایک دفعہ وہ کسی بین الاقوامی کانفرنس میں شرکت کے لئے مغربی جرمنی گئے، اور کئی مہینے ملک سے باہر رہے۔ وطن واپس آکر اُنھوں نے احباب کی محفل میں اپنے اس سفر کی روداد بیان کی۔ اور کہا کہ "مجھے اس کانفرنس میں شرکت سے بہت فائدہ ہوا۔ کئی ملکوں کی سیاحت کا مجھے موقع مِلا۔ میں مشرقی جرمنی، روس اور اسرائیل بھی گیا۔"

میں نے یہ سُن کر اُن سے پوچھا "اِن ملکوں میں جانے کی آپ کو اجازت کیسے ملی؟"

کہنے لگے "پبلک ریلیشننگ کا فن میرے کام آیا۔ کانفرنس میں ان ملکوں کے کچھ ڈپلومیٹ بھی مندوب کی حیثیت سے آئے تھے۔ میں نے جب اُن کے ملکوں سے دلچسپی کا اظہار کیا تو انھوں نے خاص طور پر میرے لئے ویزا حاصل کیا اور مجھے اپنے ساتھ لے گئے ۔۔ میں برلن گیا، ماسکو گیا، اور اسرائیل کی بھی سیر کی۔"

میں نے کہا "مجھے تو یقین نہیں آتا۔ ماسکو اور برلن تو خیر آپ جا سکتے تھے لیکن یہ اسرائیل جانا کس طرح ممکن ہوا۔ پاکستان نے تو اسرائیل کو آج تک تسلیم (RECOGNISE)

ہی نہیں کیا"۔

ڈاکٹر باقر نے کہا "میاں! کوشش کی جائے تو سب کچھ ہو سکتا ہے۔ آپ کو یقین آئے یا نہ آئے لیکن میں اسرائیل ہو کر آیا ہوں۔ موشے دایان تک سے میری ملاقات ہوئی، اور میں نے اُن سے کہا کہ آپ لوگ خواہ مخواہ مسلمانوں کے پیچھے کیوں پڑے ہوئے ہیں؟ اس سوال کا جواب اُن کے پاس نہیں تھا"۔

مجھے یہ سُن کر ہنسی آگئی، اور میں نے کہا "آپ کا اسرائیل جانا اور موشے دایان سے ملاقات کرنا ایک معجزے سے کس طرح کم نہیں ہے۔ مجھے تو یقین نہیں آتا۔ لیکن اب آپ کہتے ہیں تو ہم یقین کر لیتے ہیں۔ خیر، آپ کو یہ سفر مُبارک ہو"۔

ڈاکٹر باقر کہنے لگے "رُوس میں بھی مجھے ہر جگہ جانے کی اجازت دی گئی۔ میں ماسکو گیا تو میں نے اپنے روسی احباب سے یہ خواہش ظاہر کی کہ میں مسلمانوں کی ریاستیں، ازبکستان، تاجکستان اور آذربائیجان جانا چاہتا ہوں۔ ارباب اختیار نے اس بنیاد پر مجھے وہاں جانے کی اجازت دے دی کہ میں فارسی زبان و ادب اور ایرانی تہذیب و ثقافت کا پروفیسر ہوں۔ چنانچہ میرے سفر کے لئے خصوصی انتظامات کئے گئے، لیکن یار! مسلمانوں کی اِن ریاستوں کو دیکھ کر بہت افسوس ہوا۔ ابھی تک اِن علاقوں میں کوئی خاص ترقی نہیں ہوئی۔ غربت بہت ہے۔ میں نے دیہاتوں میں گوبر کے اُپلے تھپے ہوئے دیکھے۔ کم و بیش وہی حال ہے جو ہمارے دیہاتوں کا ہے"۔

حاضرین یہ سُن کر حیران ہوئے، اور اُن میں سے ایک صاحب نے کہا "مجھے تو یقین نہیں آتا۔ بہر حال آپ کہتے ہیں تو ہم مان لیتے ہیں"۔

غرض ڈاکٹر باقر دیر تک اپنے اس سفر کے تجربات بیان کرتے رہے، اور ہم اُن کی مبالغہ آمیز باتوں سے محظوظ ہوتے رہے۔ ہنستے رہے اور اُن کے کارناموں کی داد دیتے رہے۔

ڈاکٹر محمد باقر کی دلچسپی کے موضوعات تھے فارسی، زبان و ادب، مسلمانوں کی تاریخ اور تہذیب و ثقافت! اِن موضوعات پر اُنھوں نے قابل قدر علمی کام کیا ہے۔ اور اِن موضوعات

پر اُنہوں نے اپنے کتب خانے میں جو نادر و نایاب کتابیں بھی جمع کی ہیں، وہ اُن کا ایک اہم کارنامہ ہے۔ ان کتابوں کی تعداد کئی ہزار ہے، اور اس میں نادر و نایاب قلمی نسخے اور مطبوعہ کتابیں ہیں۔ ڈاکٹر باقر صاحب کی خواہش تھی اور ہے کہ یہ ذخیرہ پنجاب یونیورسٹی میں محفوظ ہو جائے۔ جہاں اُنہوں نے اپنی زندگی کا بیشتر حصّہ گذارا ہے۔ اس کے لئے اُنہوں نے کوشش بھی کی لیکن پنجاب یونیورسٹی کے ارباب اختیار کو تو اب ایسی چیزوں سے کوئی دلچسپی نہیں۔ اس ناکامی کے بعد باقر صاحب نے اس سلسلے میں امریکہ کی بعض یونیورسٹیوں سے رابطہ قائم کیا، اور بعض ادارے اس نادر و نایاب ذخیرۂ کتب کو لینے کے لئے تیار بھی ہو گئے لیکن حکومت پاکستان نے اس لائبریری کو باہر جانے کی اجازت نہیں دی۔ خود باقر صاحب نے بھی اس کو مناسب خیال نہیں کیا۔ چنانچہ ابھی تک اُن کی یہ کتابیں اُن کی کوٹھی ہی میں محفوظ ہیں۔ لیکن اپنی بے شمار مصروفیات کی وجہ سے اُن کی خاطر خواہ دیکھ بھال اب ڈاکٹر باقر صاحب کے بس کی بات نہیں رہی۔ اللہ تعالےٰ بہتر کرے میری دُعا ہے کہ اُن کا یہ نادر و نایاب ذخیرۂ کتب کسی علمی ادارے میں محفوظ ہو جائے تاکہ اس سے استفادہ کیا جا سکے۔

اورینٹل کالج کے دورانِ قیام میں ڈاکٹر باقر نے تحقیقی کتابوں کی طباعت و اشاعت کا بھی خاصا اہتمام کیا بہت سی نادر و نایاب کتابیں اُنہوں نے اورینٹل کالج کی طرف سے شائع کیں۔ خاص طور پر اورینٹل کالج کے جشنِ صد سالہ منانے کے سلسلے میں جو تقریبات ہونے والی تھیں، اُن کی مناسبت سے ڈاکٹر باقر صاحب نے خاصی اہم کتابوں کی طباعت کا اہتمام کیا۔ ان میں ڈاکٹر محمّد وحید مرزا صاحب کی کتاب 'حضرت امیر خسرو دہلوی'، سیّد وزیر الحسن عابدی صاحب کی دریافت کردہ غالب کی نادر و نایاب کتاب 'باغ دو در'، اورینٹل کالج میگزین میں شائع شدہ تحقیقی مقالات کی پانچ جلدیں اور ڈاکٹر باقر کی مرتب کی ہوئی نایاب لغت 'مدار الافاضل' کی چار جلدیں خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ ڈاکٹر صاحب کا مزاج علمی تھا، اور وہ اورینٹل کالج کی تحقیقی روایت کے ایک اہم علم بردار تھے۔ اس لئے اس قسم کے کاموں میں شوق اور دلچسپی کا اظہار کرتے تھے۔ خود بھی کام کرتے تھے

اور دوسروں سے کام کرواتے بھی تھے۔

ڈاکٹر باقر کا ایک اور اہم علمی کارنامہ پنجابی اکادمی کا قیام تھا۔ اس ادارے کے زیر اہتمام انہوں نے پنجابی زبان کے کلاسیکی ادب کو بڑے اہتمام سے شائع کیا، اور چند سال میں پنجابی کی غیر مطبوعہ کتابیں خاصی تعداد میں شائع کر دیں، اور یہ اُن کا ایک بہت بڑا کارنامہ ہے۔ غرض اورینٹل کالج کے دوران قیام میں انہوں نے فارسی، اُردو اور پنجابی تینوں زبانوں میں ایسے علمی کام کیے جن کو علمی دنیا کبھی بھی نظر انداز نہیں کر سکتی۔

ایک دن میں نے اُن سے اِن علمی کارناموں کا ذکر کیا، اور کہا کہ "آپ خوب کام کرتے ہیں۔ انتظامی مصروفیات کے باوجود اتنا کام کرنا آپ ہی کا حصّہ ہے"۔

کہنے لگے "پروفیسر کی عزت اس طرح کے کاموں ہی سے بڑھتی ہے، اور اُس کے وقار میں بھی انہیں کاموں سے اضافہ ہوتا ہے۔ مجھے تو کام کرنے کی عادت ہے۔ اور میں فرض سمجھ کر ان کاموں کو مکمل کرتا ہوں۔ میری کوئی اور دلچسپی بھی نہیں ہے۔ اِن کاموں میں وقت بھی اچھا گذر جاتا ہے"۔

میں نے کہا "آپ اورینٹل کالج کی علمی اور تحقیقی روایت سے تعلق رکھتے ہیں۔ آپ نے اسی کے سائے میں زندگی بسر کی ہے۔ اس لئے علمی اور تحقیقی کام آپ کا مزاج بن گیا ہے۔ دیکھ کر جی خوش ہوتا ہے"۔

غرض دیر تک ہم لوگ علمی کاموں کے موضوع پر باتیں کرتے رہے۔ جب میں نے اُن سے اجازت لی اور رخصت ہونے لگا تو باقر صاحب نے ایک اور پتے کی بات کہی۔ کہنے لگے "میاں! جب تک جوانی ہے اور صحت ٹھیک ہے، اس قسم کے کام کرو، ورنہ ایک وقت ایسا ضرور آئے گا جب ضعیفی دروازے پر دستک دے گی، صحت جواب دے گی اور خاطر خواہ کام نہیں ہو سکے گا"۔

میں نے کہا "یہ تو ہر انسان کا مُقدر ہے۔ اس صورتِ حال سے کون بچ سکتا ہے؟ اس لئے آپ کے اس مشورے پر عمل ضروری ہے کہ جب تک ہاتھ پیر چل رہے ہیں علمی کام زیادہ کرنا چاہیئے۔ ہر اُستاد کو یہ بات اپنی گرہ میں باندھ لینی چاہیئے"۔

ڈاکٹر محمدؐ باقر ہر وقت اپنے آپ کو مختلف قسم کے علمی کاموں میں مصروف رکھتے تھے یہ اُن کا محبوب مشغلہ بھی تھا اور اس کو وہ اپنا فرض منصبی بھی سمجھتے تھے۔

اس معاملے میں میں نے ڈاکٹر باقر صاحب سے بہت کچھ سیکھا۔ انہوں نے ہمیشہ میری ہمت افزائی کی اور میں نے اورینٹل کالج کے دوران قیام میں جو تھوڑا بہت علمی ادبی کام کیا، اُس میں ڈاکٹر باقر صاحب کی حوصلہ افزائی کا خاصا ہاتھ ہے۔

ڈاکٹر باقر صاحب ہمیشہ میرے کام کو سراہتے تھے، اور ہمیشہ اُس کا ذکر اچھے الفاظ میں کرتے تھے۔ حالانکہ اس میں کوئی خاص بات نہیں تھی۔ میں اس اعتبار سے خوش قسمت ہوں کہ اُن کی شفقت اور محبت مجھے نصیب رہی، اور اُن کی اس شفقت اور محبت کی وجہ سے میرا وقت اورینٹل کالج میں بہت اچھا گذرا۔ اُن کی ذات میرے لئے ہمیشہ ایک بہت بڑا سہارا رہی۔

میں جب اُردو کا پروفیسر ہوا تو وہ یہ خبر سُنتے ہی اپنی بیگم صاحبہ کے ساتھ میرے غریب خانے پر تشریف لائے، مبارک باد دی بڑی خوشی کا اظہار کیا اور کہا کہ "ایک زمانے سے میرا یہ خیال تھا کہ میرے بعد تم اورینٹل کالج کے پرنسپل ہو گے لیکن آج مجھے اس بات کا یقین ہو گیا ہے، کیونکہ تم پروفیسر ہو گئے ہو اور اورینٹل کالج کی پرنسپلی کے لئے یونیورسٹی پروفیسر ہونا ضروری ہے۔ اورینٹل کالج میں پرنسپل کی کوئی پوسٹ نہیں ہے۔ سب سے زیادہ سینئر پروفیسر کو پرنسپل بنا دیا جاتا ہے، اور یہ ایک بہت بڑا اعزاز ہے"۔

میں نے کہا میرے لئے تو اُردو کا پروفیسر ہونا بھی بہت بڑا اعزاز ہے۔ پرنسپلی کو آپ ہی سنبھالیئے۔ اُردو کی پروفیسری اور شعبۂ اُردو کی صدارت ہی میرے لئے سب کچھ ہے۔ میں تو آپ کے زیر سایہ کام کرنا چاہتا ہوں۔ آپ کی وجہ سے مجھے ڈھارس رہتی ہے"۔

غرض دو تین گھنٹے تک ڈاکٹر باقر سے اس قسم کی باتیں ہوتی رہیں۔ چلتے وقت اُنہوں نے اور اُن کی بیگم صاحبہ نے مجھے بہت دعائیں دیں۔ آج بھی میں اُن کی اس شفقت اور محبت بھری باتوں کو یاد کرتا ہوں۔

اُن کی پرنسپلی کے زمانے میں چار پانچ سال میں نے لندن میں گذارے، اور ان کی

شفقت اور محبت کی بدولت میں لندن میں سکون اور اطمینان سے رہا۔ لندن کے دوران قیام میں وہ اپنی بیگم صاحبہ کے ساتھ دو تین مہینے کے لئے برٹش کونسل کے وظیفے پر لندن آئے تو انہوں نے مجھے اپنی مہمانی کا شرف بھی بخشا۔ تقریباً دو ڈھائی مہینے میرے پاس رہے۔ اچھا وقت گذرا۔ جس دن وہ رخصت ہوئے ہیں، اسی دن ۶۵ء کی جنگ چھڑ گئی۔ میں نے انہیں روکا لیکن وہ نہیں مانے کیونکہ وہ اپنے طے شدہ پروگرام میں کوئی تبدیلی نہیں کرتے تھے۔ میں انہیں لندن کے وکٹوریا اسٹیشن پر چھوڑ کر آیا۔ یورپ کا سفر تو انہوں نے طے کر لیا لیکن عدن جا کر یہ معلوم ہوا کہ آگے راستے بند ہیں۔ ناچار انہوں نے بسوں میں سفر کیا، اور ترکی عراق، ایران اور افغانستان ہوتے ہوئے کئی مہینے کے بعد پاکستان پہنچے۔ خاصی پریشانی کا سامنا کرنا پڑا۔ لیکن وہ فون پر ہر روز مجھے اپنی خیریت سے مطلع کرتے رہے۔

اُن کی وضع داری اور محبت کا جواب نہیں تھا۔

اپنی ذاتی زندگی میں ڈاکٹر باقر صاحب ایک شفیق باپ اور ایک ذمہ دار شوہر تھے۔ اُن کی گھریلو زندگی قابلِ رشک تھی۔ وہ اپنی بیگم اور بیٹے بیٹیوں کے ساتھ قابلِ رشک زندگی بسر کرتے تھے۔ اُن کی بیگم صاحبہ نہایت نیک، شائستہ، مہذب اور محبت والی خاتون تھیں۔ ہر ایک سے اچھی طرح پیش آتی تھیں۔ مجھ پر تو اُن کی شفقت بے پایاں تھی۔ مجھے تو وہ اپنا چھوٹا بھائی سمجھتی تھیں اور میرے ساتھ ہمیشہ بڑی بہنوں کا سا برتاؤ کرتی تھیں۔ ڈاکٹر باقر صاحب کے دل میں اُن کی بڑی عزت تھی، اور وہ کوئی کام بغیر ان کے مشورے کے نہیں کرتے تھے۔ اُن کا گھر جنت کا نمونہ تھا۔ اُنہوں نے اپنے بیٹے اور بیٹیوں کو اعلےٰ سے اعلےٰ تعلیم دی، اور انہیں اپنی ہی طرح مہذب اور شائستہ بنایا۔ یہ بھی ڈاکٹر باقر صاحب اور اُن کی بیگم کا کارنامہ ہے۔

ڈاکٹر باقر صاحب کے مزاج میں درویشی تھی۔ اُن کے ذاتی اخراجات نہ ہونے کے برابر تھے۔ اپنی ساری آمدنی وہ اپنے گھر والوں پر خرچ کر دیتے تھے۔ اُن کی ہر خواہش کو پورا کرتے تھے۔ اور اُن کی بیگم اور بچے شاہانہ ماحول میں شہزادوں اور شہزادیوں کی طرح زندگی بسر کرتے تھے۔

ایک دن مجھ سے کہنے لگے "آپ کو یہ سُن کر حیرت ہوگی کہ میرا ذاتی خرچ نہ ہونے کے برابر ہے۔ میری ضروریات محدود ہیں۔ میں بہت سادہ زندگی بسر کرتا ہوں۔ میں سگریٹ تک نہیں پیتا۔ پان نہیں کھاتا۔ سوائے پڑھنے لکھنے کے میرا کوئی اور شغل نہیں ہے۔ کتابوں کا رسیا ہوں۔ بس اچھی کتابوں پر تھوڑا بہت خرچ کرتا ہوں"۔

میں نے کہا "آپ تو درویش ہیں۔ میں آپ کی سادگی کی داد دیتا ہوں۔ اس قسم کے لوگ میں نے زندگی میں کم ہی دیکھے ہیں۔ آپ اپنے نام کے ساتھ فقیر کا لفظ لکھتے ہیں، یہ لفظ آپ کو زیب دیتا ہے"۔

ڈاکٹر باقر صاحب کہنے لگے "میاں! اس طرح کی زندگی بسر کرنے میں بڑی عافیت ہے۔ دُنیا میں ساری خرابیاں ضرورتوں کو بڑھانے، اور حرص و ہوس سے کام لینے کی وجہ سے پیدا ہوتی ہیں۔ میں نے ان باتوں سے اپنے آپ کو بے نیاز کرلیا ہے۔ میں واقعی فقیر ہوں"۔

مجھے تقریباً پچیس سال تک ڈاکٹر باقر صاحب کو بہت قریب سے دیکھنے کا موقع ملا۔ اُن میں کچھ کمزوریاں بھی تھیں۔ لیکن کمزوریاں کس انسان میں نہیں ہوتیں! انسان تو خطا کا پتلا ہے۔ میں باقر صاحب کی ان کمزوریوں اور خطاؤں کا خاموش تماشائی رہا، اور ان کمزوریوں کو اُن کی نفسیاتی الجھنوں پر محمول کرکے ہمیشہ ان سے چشم پوشی کرتا رہا۔ اس کی تفصیل ناگفتنی ہی رہے تو بہتر ہے۔

اورینٹل کالج کی پرنسپلی سے ریٹائر ہونے سے چند سال قبل ڈاکٹر باقر کو غصہ بہت آنے لگا تھا۔ غالباً اس کا سبب ہائی بلڈ پریشر تھا۔ اس زمانے میں قوت برداشت اُن میں باقی نہیں رہی تھی۔ معمولی سے معمولی اختلاف پر بگڑ جاتے تھے، اور غصہ اس قدر آتا تھا کہ نہ جانے کیا کیا کچھ کہنے لگتے تھے۔ خاص طور پر مختلف کمیٹیوں اور میٹنگوں میں یہ صورتِ حال اکثر پیدا ہوتی تھی۔ ایسے مواقع پر میں انہیں سنبھالتا تھا، اور وہ میری بات مان کر غصے کو ٹھنڈا کرتے تھے۔ لیکن بعض اوقات ایسی صورت حال پیدا ہوتی تھی کہ میں بھی پریشان ہو جاتا تھا۔ خاص طور پر طلباء و طالبات کے معاملات میں اُن کا غصہ اس درجۂ حرارت پر پہنچ

جاتا تھا کہ مجھے دن میں تارے نظر آنے لگتے تھے۔

اُن کے ریٹائرمنٹ سے قبل دو تین سال ایسے گذرے جب مجھے اُن کی اس کیفیت کی وجہ سے خاصی آزمائشوں کا سامنا کرنا پڑا۔ لیکن شُکر ہے کہ میں اس امتحان میں پورا اُترا۔ باقر صاحب سے جو قُربت مجھے حاصل تھی وہ ایسے مواقع پر میرے کام آئی۔ میں نے جب بھی انہیں احساس دلایا تو اُن کا غصّہ ٹھنڈا ہو گیا۔ اُنھوں نے میری بات مانی اور اس طرح کالج کی ناخوشگوار فضا کو معمول پر لانے میں مجھے کامیابی ہوئی۔ ڈاکٹر باقر سے میری دوستی نہ ہوتی تو یہ سب کچھ ممکن نہ ہوتا۔

ڈاکٹر محمد باقر کو اورینٹل کالج سے ریٹائر ہوئے اب تقریباً بیس سال ہو چکے ہیں۔ اُن کی عمر اب ماشاء اللہ اسّی کے قریب ضرور ہے۔ لیکن اس عمر میں بھی وہ اپنا زیادہ وقت علمی کاموں میں گذارتے ہیں۔ اللہ تعالےٰ نے انہیں سب کچھ دیا ہے۔ وہ دولت، عزّت شہرت اور ناموری سے مالا مال ہیں۔ البتہ اس عمر میں تنہائی اُن کے لئے ایک عذاب ضرور ہے۔ کیونکہ اُن کے تمام بچوں نے اپنے اپنے گھر بسا لئے ہیں، اور وہ سب مُلک سے باہر ہیں۔ اُن کے نہ ہونے سے باقر صاحب کا گھر اُداس اور سوگوار ہے، اور وہ اِس اُداسی اور سوگواری کی فضا میں اسیر بلکہ یوں کہنا چاہیئے کہ پا بہ زنجیر ہیں۔

لیکن یہ سب کچھ تو انسان کا مُقدّر ہے!

بقول علامہ اقبال رح

یہ مال و دولتِ دُنیا یہ رشتۂ و پیوند
تمام وہم و گماں لَا اِلٰہَ اِلاَّ اللہ

ڈاکٹر رانا اِحسان اِلٰہی

ڈاکٹر رانا احسان اِلٰہی اورینٹل کالج میں میرے ایسے دوست اور رفیق کار تھے جن کی دوستی اور رفاقت پر میں فخر کرتا ہوں۔ وہ عربی اور اسلامیات کے بہت بڑے عالم، انتظامی امور کے بہت بڑے ماہر اور نہایت مخلص دوست اور رفیق کار تھے۔ فرائض منصبی سے خوش اسلوبی کے ساتھ عہدہ برآ ہونے والے ایسے دوست

اور اپنے رفقائے کار سے تعاون کرنے والے ایسے مستعد لوگ میں نے زندگی میں کم ہی دیکھے ہیں۔ خوش مزاجی اُن کی گھٹی میں پڑی تھی، اور اسی کی بدولت وہ کالج کے انتظامی معاملات کا بڑا سے بڑا بوجھ بھی اُٹھانے کیلئے تیار ہو جاتے تھے۔ شب و روز کام کرنا اُن کے معمولات میں داخل تھا۔ اورینٹل کالج کی پرنسپلی کے زمانے میں اُنہوں نے ہمیشہ میرے ساتھ تعاون کیا۔ کاموں کے بڑے بڑے منصوبوں میں میری مدد کی، اِن منصوبوں کو عملی صورت دینے میں ہمیشہ میرا ہاتھ بٹایا، اور اس طرح مشکل سے مشکل کام کو میرے لئے آسان بنا دیا۔

ایک زمانے تک ڈاکٹر رانا اورینٹل کالج میں شعبۂ عربی کے صدر رہے، اور ان کی صدارت کے زمانے میں شعبۂ عربی نے ترقی کی بہت سی منزلیں طے کیں۔ اُنہوں نے اس زمانے میں قابل قدر تحقیقی کام کیا، اور اپنے رفقاء کو بھی تحقیقی کام کرنے کی طرف توجہ دلائی۔ رانا صاحب اور اُن

کے رفقائے کار کے مقالے خاصی تعداد میں اورنٹیل کالج میگزین اور دوسرے علمی رسائل میں شائع ہوئے۔ انتظامی معاملات میں بھی بہ حیثیت صدر شعبۂ عربی ڈاکٹر رانا نے اپنی صلاحیت اور محنت سے اہم کارنامے انجام دیئے۔اس طرح شعبے میں صحت مندانہ فضا پیدا ہوئی۔

اورنٹیل کالج کے شعبہ عربی میں ریڈر کی حیثیت سے آنے سے قبل میں نے ڈاکٹر رانا کے بارے میں بہت کچھ سن رکھا تھا۔مجھے یہ معلوم ہوا تھا کہ وہ اورنٹیل کالج کے ہونہار طالب علم اور پروفیسر شفیع مرحوم کے خاص شاگرد رہے ہیں اور اُنہوں نے کیمبرج یونیورسٹی اور پنجاب یونیورسٹی سے عربی اور اسلامی علوم میں پی ایچ ڈی کی ڈگریاں بھی حاصل کی ہیں۔ اُنہوں نے مُلتان اور لائل پور کے گورنمنٹ کالجوں میں بھی بہ حیثیت پروفیسر عربی اور اسلامیات گراں قدر خِدمات انجام دی ہیں۔ وہ اپنی درویشانہ طرز زندگی کی وجہ سے احسان الٰہی جوگی کہلاتے تھے اور رسالوں میں اسی نام سے افسانے اور مضامین لکھتے تھے۔جب پنجاب یونیورسٹی میں پروفیسر شفیع مرحوم کی سربراہی میں ادارۂ معارف اسلامیہ کا شعبہ قائم ہوا تو وہ پروفیسر صاحب کی سفارش پر اورنٹیل کالج اور ادارۂ معارف اسلامیہ میں ریڈر مقرر کیئے گئے، اور کئی سال تک انہوں نے ان دونوں حیثیتوں میں قابل قدر تدریسی اور علمی خِدمات انجام دیں۔ وہ نہایت قابل آدمی تھے۔ اسی لیئے پروفیسر شفیع مرحوم اُن کی عِزّت کرتے تھے، اُن سے زیادہ سے زیادہ علمی کام لیتے تھے، اور اُن کی تحقیقی اور علمی صلاحیتوں کو سراہتے تھے۔

وہ جب اورنٹیل کالج میں عربی کے ریڈر کی حیثیت سے آئے تو ان سے میری مُلاقات ہوئی۔ ایک دن میں اورنٹیل کالج کے اسٹاف روم میں بیٹھا ہوا کسی کام میں مصروف تھا کہ ایک صاحب چک اُٹھا کر اندر آئے۔ میانہ قد، گول چہرہ، گندمی رنگ، گٹھا ہوا کسرتی جسم، نہایت عمدہ سوٹ میں ملبوس۔۔ میرے پاس آکر بیٹھ گئے۔

اور کہا میرا نام احسان الٰہی رانا ہے۔ میں عربی کے شعبے میں ریڈر اور صدر شعبہ کی حیثیت سے ابھی کل ہی یہاں آیا ہوں۔ انسائیکلو پیڈیا آف اسلام کے شعبے میں بھی کام کروں گا۔

سوچا، آپ سے مل لوں"۔

میں نے اُن سے کھڑے ہو کر معانقہ کیا، اور کہا "خوش آمدید! خاصے عرصے سے آپ کے آنے کی خبریں مل رہی تھیں، اورا ورنیٹل کالج بے چینی سے آپ کے آنے کا انتظار کر رہا تھا۔ شکر ہے کہ آپ آگئے۔ آپ کو نئی ذمہ داریاں مبارک ہوں!"

میں نے چائے منگوائی اور دیر تک ہم لوگ چائے پیتے اورا ورنیٹل کالج، کیمبرج، لندن، اور آکسفورڈ کی باتیں کرتے رہے۔ ڈاکٹر رانا کی باتوں سے میں نے اندازہ لگایا کہ وہ نہایت شائستہ، مہذب اور مخلص انسان ہیں، اور اُن کی شخصیت میں ایک ایسے عالم کی خصوصیات ہیں جس کا علم حاضر ہوتا ہے۔ مجھے وہ اچھے انسان معلوم ہوئے، اِس لئے اس پہلی ملاقات کے دن سے لے کر آج تک میرے اُن کے ساتھ دوستانہ تعلقات ہیں، اور میں اُن کی دوستی پر فخر کرتا ہوں۔ ایسے مخلص اور محبت کرنے والے دوست آج کل کہاں ملتے ہیں۔

میں جب اورنیٹل کالج کا پرنسپل ہوا تو ایک دن ڈاکٹر رانا میرے پاس آئے۔ ایک فائل میری طرف بڑھائی، اور کہا کہ "اس کو ذرا دیکھ لیجئے"۔

یہ شعبۂ عربی کے ایک اُستاد ڈاکٹر امین اللہ وثیر کی فائل تھی — میں نے اس فائل کو پڑھا تو یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ ڈاکٹر امین اللہ وثیر کو اگرچہ شعبے میں کام کرتے ہوئے چھ سات سال ہو چکے ہیں لیکن ابھی تک انہیں کنفرم نہیں کیا گیا۔ حالانکہ وہ اورنیٹل کالج کے برگزیدہ طالب علم اور عربی میں فرسٹ کلاس ایم۔ اے تھے۔ چھ سات سال انہوں نے اُستاد کی حیثیت سے شعبۂ عربی میں کام بھی کیا تھا۔ اُن کے مقالات بھی خاصی تعداد میں مختلف علمی رسائل میں شائع ہو چکے تھے۔

لیکن عجیب بات ہے کہ جب تقرر کے دو سال بعد اُن کے کنفرمیشن کا مسئلہ سامنے آیا تو ان کے اساتذہ تک نے اُن کی مخالفت کی اور یہ لکھا کہ انہیں مستقل نہیں ہونا چاہیئے اس میں کچھ پردہ نشینوں کے بھی نام تھے۔

میں نے یہ فائل دیکھی تو مجھے بہت افسوس ہوا۔ کیونکہ میں اس خیال کا پرنسپل تھا کہ یونیورسٹی میں کسی اُستاد کا کنفرمیشن ایک رسمی سی بات ہے۔

امین اللہ وثیر کے کاغذات لے کر میں سیدھا وائس چانسلر صاحب کے پاس گیا، صورتِ حال سے انہیں آگاہ کیا، اور اس معاملے میں اپنے مؤقف کی وضاحت کی۔

وائس چانسلر حمید احمد خاں صاحب نے میری باتیں سُن کر اپنی دراز میں سے ایک فائل نکالی، اور کہا کہ اس کو پڑھ لیجیئے۔ پروفیسر شفیع، ڈاکٹر عبداللہ، ڈاکٹر باقر سب نے اُن کے کنفرمیشن کی مخالفت کی ہے۔ صرف ڈاکٹر رانا احسان الٰہی نے اُن کے حق میں لکھا ہے۔ لیکن تین بڑے آدمیوں کی مخالفت ہو تو میں کیا کر سکتا ہوں؟

میں نے کہا میں اس وقت اورینٹل کالج کا پرنسپل ہوں، اور پرنسپل کی حیثیت سے میں سمجھتا ہوں کہ یہ امین اللہ وثیر کے ساتھ زیادتی ہے۔ انہیں فوراً کنفرم ہونا چاہیئے۔ وہ عربی میں فرسٹ کلاس ایم۔ اے ہیں۔ چھ سات سال سے پڑھا بھی رہے ہیں۔ اپنے مضمون میں اُنہوں نے اعلیٰ درجے کے تحقیقی مقالے بھی شائع کئے ہیں۔ ایک لیکچرار کے کنفرمیشن کے لئے اور کیا چاہیئے؟۔

میرے یہ تیور دیکھے تو خاں صاحب کھُل گئے اور کہا کہ آپ اِن بزرگوں کی مخالفت کے باوجود اگر وثیر کو کنفرم کروانا چاہتے ہیں تو پرنسپل کی حیثیت سے اُن کے بارے میں ایک نوٹ لکھ دیجیئے۔ میں اس معاملے کو پھر سنڈیکیٹ میں رکھ دوں گا۔ آپ کی بات معقول ہے اس لئے میں تو آپ سے اتفاق کروں گا۔ لیکن آپ ڈاکٹر جسٹس ایس۔ اے۔ رحمٰن صاحب کو ذاتی طور پر اس صورتِ حال سے آگاہ کر دیجیئے تاکہ اس معاملے میں اُن کی حمایت ہمیں حاصل ہے۔

چنانچہ میں نے امین اللہ وثیر کے بارے میں مفصل نوٹ لکھا۔ رحمٰن صاحب مرحوم کو بھی توجہ دلائی اور میری تجویز پہ سنڈیکیٹ نے امین اللہ وثیر کو کنفرم کر دیا۔

مجھے اس فیصلے سے خوشی ہوئی۔ ڈاکٹر رانا بھی خوش ہوئے۔ کیونکہ امین اللہ وثیر کو اورینٹل کالج میں نئی زندگی ملی۔

ڈاکٹر رانا تقریباً بیس سال اورینٹل کالج میں رہے۔ میں اس عرصے میں اُردو کا پروفیسر اُردو کے شعبے کا صدر اور اورینٹل کالج کا پرنسپل ہو گیا۔ لیکن ڈاکٹر رانا عربی کے ریڈر رہے اور پروفیسر نہ ہو سکے۔ اُن کا پروفیسر نہ ہونا ویسا ہی المیہ ہے جس سے عابدی صاحب

مرحوم کو شعبۂ فارسی میں دوچار ہونا پڑا۔ یہ دونوں اپنے مضمون میں عالم ہونے کے باوجود پروفیسر نہ ہوسکے۔ اس پر جتنا بھی ماتم کیا جائے کم ہے۔

پروفیسر ہونے کے لئے ڈاکٹر رانا نے تمام مراحل طے کر لئے تھے۔ رپورٹیں اُن کے حق میں آ گئی تھیں لیکن پھر نہ جانے کیا ہوا، اُن کے لئے یہ شرط لگا دی گئی کہ انہیں عرب ممالک میں جا کر عربی بولنے کی مشق کرنی چاہیئے۔ یہ عجیب وغریب شرط تھی۔

ایک دن میں نے اس وقت کے وائس چانسلر صاحب کی خدمت میں حاضر ہو کر انہیں اس عجیب وغریب شرط کی طرف توجہ دلائی اور کہا کہ "ڈاکٹر رانا صاحب عربی اور اسلامی علوم کے بہت بڑے عالم ہیں۔ عربی روانی کے ساتھ لکھتے ہیں۔ بولنے میں بھی انہیں کوئی خاص دقّت نہیں ہوتی"۔

وائس چانسلر صاحب نے کہا "عربی کے پروفیسر کو عرب اہل زبان کی طرح عربی بولنی چاہیئے"۔

میں نے کہا "کیا ماضی میں جو عربی کے بڑے بڑے پروفیسر اس یونیورسٹی میں تھے وہ عربوں کی طرح عربی بول سکتے تھے؟ مجھے معلوم ہے کہ پروفیسر شفیع صاحب، ڈاکٹر برکت علی قریشی صاحب اور ڈاکٹر شیخ عنایت اللہ صاحب عربی زبان وادبیات کے پروفیسر اور عربی اور اسلامی علوم کے بہت بڑے عالم تھے لیکن عربوں کی طرح عربی نہیں بول سکتے تھے۔ انگلستان اور یورپ کی یونیورسٹیوں میں بھی عربی کے پروفیسروں کا یہی حال ہے۔ یہ مشقِ ستم صرف ڈاکٹر رانا ہی پر کیوں کی جا رہی ہے؟"

اِس کا جواب وائس چانسلر صاحب کے پاس نہیں تھا۔ جب اُن سے کچھ بن نہیں پڑا تو فرمایا "ڈاکٹر رانا کو باہر جانے اور چند مہینے عرب ممالک میں گذارنے سے فائدہ ہی ہوگا۔ واپس آئیں گے تو یہاں بھی لوگ اُن سے استفادہ کریں گے"۔

میں نے کہا "میں ڈاکٹر رانا کو باہر جانے پر آمادہ کروں گا۔ لیکن واپسی پر اُن کی پروفیسر شپ کے معاملے میں یونیورسٹی ڈنڈی نہ مارے، اور انہیں فوراً پروفیسر بنا دیا جائے"۔

اس تجویز پر اتفاق ہو گیا۔ ڈاکٹر رانا میرے کہنے پر ایک تعلیمی سال کے لئے عرب

ممالک میں چلے گئے۔ لیکن ان کی عدم موجودگی میں اُن کے خلاف ڈھنڈورے پٹنے لگے۔ میں نے جس حد تک ممکن ہوا اس کا سدباب کیا، اور ڈاکٹر رانا کو لمبے لمبے خط لکھ کر اُن کی ہمت بڑھائی تاکہ وہ باہر کے ملکوں میں اطمینان اور سکون سے کام کر سکیں۔ انہوں نے وہاں رہ کر مفید کام کیا۔ لیکن جب وہ واپس آئے تو وائس چانسلر صاحب بدل چکے تھے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ اُن کا معاملہ کھٹائی میں پڑ گیا۔ دفتر والوں نے مشق ستم کی اور عربی کی پروفیسری کا پھر اشتہار دے دیا گیا۔ ڈاکٹر رانا کو پھر درخواست دینی پڑی۔ اب کے اُن کے کچھ شاگرد اور جونیئر اُستاد بھی میدان میں آ گئے۔ دفتر کے کچھ متعلقہ لوگ اُن سے مل گئے اور میں نے یہ سنا کہ ایک سازش کے تحت اُن کی ایک رپورٹ بھی اِدھر اُدھر کر دی گئی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ رانا صاحب اب کے بھی پروفیسر نہ ہو سکے۔

ڈاکٹر رانا نے اس عجیب و غریب صورت حال کا بڑی جرأت، بہادری اور بردباری سے مقابلہ کیا۔ اپنے کاموں میں لگے رہے۔ چند سال بعد وہ ریڈر ہی کی حیثیت سے ریٹائر ہو گئے۔

میں نے بہ حیثیت پرنسپل اُن سے درخواست کی کہ وہ کالج آتے رہیں، اور کم از کم ریسرچ کا کام کرتے رہیں، اور سترہ ریسرچ اسکالر جو اُن کی نگرانی میں پی ایچ ڈی کا کام کر رہے ہیں اُن کی نگرانی کا کام جاری رکھیں۔ مختلف قسم کے کام اُن کے سپرد کئے جن سے اُن کا کاروبارِ حیات چلتا رہا۔

یہ زمانہ اُن کے لئے بڑی آزمائش کا زمانہ تھا۔ وہ ۵۸ سال کی عمر میں اچانک ریٹائر ہوئے تھے۔ اُن کی پنشن بھی کم تھی۔ اس لئے خاصی پریشانی میں اُن کا وقت گذرا۔ لیکن کوئی سال بھر بعد انہیں (NES PAK) میں باقاعدہ ملازمت مل گئی، اور وہ ابھی تک اس ادارے میں علمی کام کرتے ہیں۔

میری پرنسپلی کے زمانے میں انہوں نے کالج کے انتظامی امور میں میرا ہاتھ بٹایا، اور ایسے ایسے کام کئے جو سوائے اُن کے کوئی اور نہیں کر سکتا تھا۔

خصوصیت کے ساتھ جب اورینٹل کالج کا جشن صد سالہ منایا گیا تو اس کے سیکرٹری انتظامیہ کے طور پر انہوں نے اپنے حسن انتظام کا لوہا منوا لیا۔ اس موقع پر ماہرین علوم مشرقی کی جو کانگرس

منعقد ہوئی، اُس کو کامیاب بنانے کے لئے انہوں نے شب و روز کام کیا۔ مجھے مفید مشورے دیئے، اور عملی طور پر میرے ساتھ اس سلسلے میں ہر منصوبے کو عملی شکل دینے میں پوری طرح شریک رہے۔ انہوں نے عرب ممالک کے مندوبین کو کانفرنس میں شریک ہونے کے لئے آمادہ کیا۔ چنانچہ اس کانگریس میں سعودی عرب، عرب امارات، شام، عراق، مصر اور مراکش کے مندوبین اپنے خرچ پر لاہور آئے، اور انہوں نے اس کانگریس میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ انگلستان، امریکہ، جرمنی، اٹلی، ترکی اور افغانستان کے مندوبین کو بھی بُلانے میں وہ پیش پیش رہے۔ ایران کے مندوبین کو بُلانے کا کام میں نے ڈاکٹر بناہی کے سپرد کیا تھا جو اُس زمانے میں اورینٹل کالج میں فارسی کے وزیٹنگ پروفیسر تھے۔ ڈاکٹر رانا نے اُن کے ساتھ مل کر کام کیا چنانچہ ایران کے مندوبین بھی خاصی تعداد میں اپنے خرچ پر لاہور آئے اور کانفرنس میں شرکت کر کے اس کو کامیابی سے ہم کنار کیا۔

ڈاکٹر رانا نے اِن مندوبین کے ٹھہرنے کا بھی معقول بندوبست کیا، اور ڈاکٹر عُبیداللہ خاں کے ساتھ مل کر اُن کے طعام و قیام کا ایسا انتظام کیا کہ لوگ دیکھ کر حیران رہ گئے۔ سات دن تک اس کانگریس کے اجلاس ہوتے رہے، اور کبھی کسی کو کھانے پینے کے معاملے میں کوئی شکایت نہیں ہوئی۔

پھر کانگریس کے اختتام پر جب میں نے اس کی روداد دو ضخیم جلدوں میں شائع کی تو اس کا بیشتر کام بھی ڈاکٹر رانا ہی نے کیا۔ مقالات کے پروف پڑھے اور طباعت کے سلسلے میں بھی اپنے مفید مشوروں سے مجھے نوازا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ دو ضخیم اور نہایت ہی خوبصورت جلدیں اس روداد کی تیار ہو گئیں جن کو دُنیا کی تمام اہم یونیورسٹیوں اور تحقیقی اداروں میں پسند کیا گیا۔ اور اس طرح اورینٹل کالج کی شہرت دُور دُور تک پھیل گئی۔

ڈاکٹر رانا کو انتظامی معاملات کا وسیع تجربہ تھا۔ انہوں نے دُنیا کی کئی اہم یونیورسٹیاں دیکھی تھیں، اور وہاں کام کیا تھا۔ اس لئے اکیڈمک ایڈمنسٹریشن کو خوب سمجھتے تھے۔ خود بھی اخلاص اور تن دہی کے ساتھ کام کرتے تھے اور لوگوں سے کام بھی خوب لیتے تھے۔ ہر وقت خوش اور ہشاش بشاش رہنا اُن کے مزاج میں داخل تھا۔ مزاج کی اس کیفیت کی

بدولت وہ اپنے آس پاس اور گردوپیش ایسی فضا پیدا کر لیتے تھے جس میں کام کسی پر بوجھ نہیں بنتا تھا۔ اُن کے ساتھ سارا عملہ خندہ پیشانی کے ساتھ کام کرتا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ انتظامی معاملات میں کامیابی و کامرانی اُن کے قدم چومتی تھی۔

وہ بڑے ہی معاملہ فہم آدمی تھے، اور مسائل کو سُلجھانے میں اُن کا جواب نہیں تھا۔ میرے تو وہ پیچیدہ سے پیچیدہ مسائل کو چشم زدن میں حل کر دیتے تھے، اور ایمان کی بات یہ ہے کہ اُن کی اس صلاحیت کی وجہ سے میرا انتظامی کاروبار بڑی خوش اسلوبی سے رواں دواں رہتا تھا۔ کسی کو ایسا مستعد اور مخلص رفیق کار مل جائے تو یہ اُس کی خوش قسمتی ہے۔ میں اپنے آپ کو واقعی خوش قسمت سمجھتا ہوں کہ مجھے اورینٹل کالج میں ڈاکٹر رانا کا ایسا رفیق کار ملا، جس نے میرے انتظامی بوجھ کو بڑی حد تک ہلکا کر دیا۔ میں اُن کی رفاقت اور دوستی پر آج بھی فخر کرتا ہوں، اور کوئی بھی مسئلہ ہو تو اُن سے مشورہ کرتا ہوں، اور وہ اپنی خداداد ذہانت، اپنی معاملہ فہمی اور فہم و فراست سے چند منٹ میں اُس کو حل کر دیتے ہیں۔

اللہ تعالےٰ انہیں تا دیر سلامت اور ہمیشہ خوش و خُرّم رکھے!

اورینٹل کالج کی ملازمت کے زمانے میں ڈاکٹر رانا ہمیشہ ہشاش بشاش اور چاق و چوبند رہتے تھے۔ سائیکل پر جہاں چاہتے تھے منٹوں میں پہنچ جاتے تھے۔ دن بھر کاموں میں اپنے آپ کو مصروف رکھنا اُن کا معمول تھا۔ لیکچروں کے بعد دیر تک کالج میں موجود رہتے تھے۔ کبھی ایسا نہیں ہوا کہ میں نے ڈاکٹر رانا کو یاد کیا ہو، اور وہ اپنے کمرے میں موجود نہ ہوں۔ ایسی محنت اور لگن سے کام کرنے والے مستعد اور مخلص اشخاص میں نے زندگی میں کم ہی دیکھے ہیں۔

ڈاکٹر رانا اپنا زیادہ وقت مطالعے میں گذارتے تھے۔ اُن سے بات کر کے یہ معلوم ہوتا تھا کہ وہ علم کا ایک سمندر ہیں۔ عربی تو ایسی لکھتے اور بولتے تھے کہ عرب بھی کیا لکھیں گے اور بولیں گے۔ پھر ادب، فقہ، حدیث اور قرآن پر اُن کی نظر بڑی گہری تھی۔ اُن کے لیکچر بڑے ہی معلومات افزا ہوتے تھے۔ اس زمانے میں جو مقالات انہوں

نے لکھے وہ عربی ادب اور اسلامی علوم میں گراں قدر اضافے کی حیثیت رکھتے ہیں۔ یہ مقالات مختلف رسائل میں بھی چھپے اور ادارۂ معارف اسلامیہ کی مختلف جلدوں میں بھی شائع ہوئے ہیں۔

۱۹۷۷ء میں ہم نے علامہ اقبالؒ کے جشن صد سالہ کے موقع پر اورینٹل کالج میگزین کے دو خاص نمبر اقبالیات کے موضوع پر شائع کئے۔ ان خاص نمبروں کو میں نے کتابی شکل بھی دی جن کو ساری دُنیا کی یونیورسٹیوں میں پسند کیا گیا۔ انگریزی کے جشن نامۂ اقبالؒ کے لئے اس زمانے میں ڈاکٹر رانا نے "علاّمہ اقبالؒ اور اجتہاد" کے موضوع پر انگریزی میں بڑی محنت سے ایک جامع مقالہ لکھا جو کتابی صورت میں علیحدہ بھی شائع ہوا۔ یہ بڑا ہی عالمانہ مقالہ تھا۔ اس میں ڈاکٹر رانا نے نئی معلومات بھی فراہم کی تھی۔ اور اسلامی فقہ کے بعض معاملات کو بڑی خوش اسلوبی سے پیش کیا تھا۔ میرے خیال میں یہ مقالہ واحد مقالہ ہے جو علاّمہ اقبالؒ کے تصوّرِ اجتہاد کو سمجھنے میں مدد کرتا ہے۔ ایک زمانے تک نہ صرف پاکستان اور ہندوستان بلکہ عرب اسلامی ممالک اور انگلستان، جرمنی، امریکہ اور روس کی یونیورسٹیوں میں بھی اس مقالے کا چرچا رہا۔

اورینٹل کالج کے دورانِ قیام میں ڈاکٹر رانا احسان الٰہی نے بہ حیثیت صدر شعبۂ عربی علم کے موتی لٹائے۔ بے شمار طالب علموں کو علم کی دولتِ بیش بہا سے مالا مال کیا۔ سیکڑوں اسکالروں کی رہنمائی کر کے انہیں پی ایچ ڈی کی ڈگریاں دلائیں اور طلباء وطالبات میں علمی کام کرنے کی دُھن اور لگن پیدا کی۔ اُن کے طالب علم اسی وجہ سے آج بھی اُن کا نام عزت و احترام سے لیتے ہیں، اور اُن کے آس پاس اس طرح رہتے ہیں جیسے شمع کے آس پاس پروانے یا چشمۂ شیریں کے گرد مردم و مرغ و مور!

ڈاکٹر رانا اُن طالب علموں میں حوصلہ اور ولولہ پیدا کرتے ہیں اور اُن کی رہنمائی میں ہمیشہ پیش پیش رہتے ہیں۔ رانا صاحب کا خیال ہے کہ یہی اُستاد کا صحیح منصب ہے۔ ڈاکٹر رانا ایک بہت بڑے عالم، ایک بلند پایہ اُستاد اور عظیم پروفیسر ہیں۔ اُن کو دیکھ کر کیمبرج، آکسفورڈ اور لندن کے بڑے بڑے پروفیسروں کی یاد تازہ ہوتی ہے۔

میرے لئے تو وہ ایک مخلص دوست ہیں۔ وہ ایک ایسے دوست اور رفیق کار ہیں جن پر بھروسہ کیا جا سکتا ہے۔ محبت، نیکی اور شرافت سے اُن کا خمیر اُٹھا ہے۔ وہ ایک بہت اچھے انسان ہیں۔ وہ محبت کرنا جانتے ہیں۔ اُن کا اخلاق بہت بلند ہے۔ تہذیب و شائستگی اُن کی گھٹی میں پڑی ہے۔ اُن کی شخصیت مشرق و مغرب کی اعلیٰ و ارفع اقدار کا ایک حسین سنگم ہے۔ وہ لوٹ کر محبت کرتے ہیں اور جذب و جنوں کی دولت بیش بہا سے مالا مال ہیں۔

ڈاکٹر رانا کے کردار کی اِن خصوصیات کا اندازہ اُس وقت ہوتا ہے جب کسی کو اُن سے کوئی کام آن پڑتا ہے، اور جب کسی دوست کو اُن کی مدد کی ضرورت ہوتی ہے۔ ایسے مواقع پر وہ اس شعر کی ایسی تصویر بن جاتے ہیں جس میں تخلیقی آن بان اور مصورانہ شان اپنے شباب پر نظر آتی ہے ؎

دوست آں باشد کہ گیرد دستِ دوست
در پریشاں حالی و درماندگی

پروفیسر
ڈاکٹر طارق سومر

پروفیسر ڈاکٹر طارق سومر ترکی کی ایک نامور شخصیت ہیں۔ وہ ایک مشہور ماہر تعلیم، معروف سائنس داں اور انقرہ یونیورسٹی کے رکٹر ہیں۔ میں جب تین سال کے لیئے اردو اور مطالعۂ پاکستان کے پروفیسر کی حیثیت سے انقرہ یونیورسٹی گیا تو اُن میں میری مُلاقات ہوئی، اور اس ملاقات میں انہوں نے ایسے خلوص و محبت، اور تہذیب و شائستگی کا اظہار کیا کہ اس پہلی ہی ملاقات نے دوستی کا روپ اختیار کرلیا۔ انقرہ یونیورسٹی کے دوران قیام میں اُن سے یہ دوستی میرے لیئے ایک بہت بڑا سہارا رہی۔

میری اُن سے یہ پہلی مُلاقات اُن کے دفتر میں ہوئی۔ ہوا یوں کہ جس دن میں نے انقرہ یونیورسٹی میں پروفیسر کی حیثیت سے اپنی ذمہ داریاں سنبھالیں، اسی دن میں فارسی کی پروفیسر اور شعبۂ علوم مشرقی کی صدر ملیحہ خانم صاحبہ اور اُردو کے اُستاد ڈاکٹر شوکت بولو کے ساتھ اُن کے دفتر گیا۔

ہم لوگ سہ پہر کو چار بجے کے قریب اُن کے دفتر پہنچے تو وہ ہمارا انتظار کر رہے تھے۔ ہم لوگوں نے اطلاع کروائی تو وہ خود اپنے کمرے سے باہر آئے اور بڑے تپاک سے ملے۔ اندر لے گئے۔ آرام دہ صوفوں پر ہمیں بٹھایا، خود بھی ہمارے ساتھ بیٹھے اور بڑی محبت کے ساتھ انگریزی زبان میں باتیں کرنے لگے۔

سب سے پہلے میری طرف متوجہ ہوئے اور پوچھا آپ کا سفر کیسا گذرا؟ کوئی تکلیف

تو نہیں ہوئی"۔

میں نے کہا میں "بڑے آرام سے اسلام آباد سے استنبول اور استنبول سے انقرہ پہنچا۔ ڈاکٹر شوکت بولو صاحب اپنے چند طلباء اور طالبات کے ساتھ ہوائی اڈے پر پہنچ گئے تھے۔ اُنہوں نے مجھے یونیورسٹی کے مہمان خانے نینے خاتوں پر یونیورسٹی کے کونک ایوی میں پہنچا دیا۔ میرا قیام وہیں ہے۔ وہاں ہر طرح کا آرام ہے۔ پروفیسر ملیحہ خانم صاحبہ نے فیکلٹی میں میرا کمرہ بھی ٹھیک کروا دیا ہے وہاں ڈاکٹر شوکت بولو ہر وقت میرے ساتھ رہتے ہیں۔ ان کی وجہ سے بڑا اطمینان ہے۔ میں اپنے آپ کو یہاں "یبانجی" (اجنبی) محسوس نہیں کرتا"۔

ڈاکٹر طارق سومر نے کہا "ترک پاکستان میں اور پاکستانی ترکی میں اپنے آپ کو اجنبی محسوس نہیں کرتے۔ آپس میں اتنی محبت ہے کہ اجنبی ہونے کا شائبہ تک نہیں ہوتا۔ میں گذشتہ چند برسوں میں کئی دفعہ پاکستان گیا ہوں۔ مجھے تو وہاں ہمیشہ یہی محسوس ہوا جیسے میں ترکی میں ہوں"۔

میں نے کہا "ترکی اور پاکستان کے رشتے تاریخی ہی نہیں، خون کے رشتے بھی ہیں"۔

کہنے لگے "آپ نے بالکل صحیح کہا۔ ایسا نہ ہوتا تو اِن دونوں ملکوں کے لوگوں میں ایسی یگانگت اور اتنی محبت نہ ہوتی۔ ترکی اور پاکستان ایک ہیں"۔

پھر انہوں نے کچھ انقرہ یونیورسٹی کا حال احوال بیان کیا، اور شعبۂ مطالعۂ پاکستان اور اردو کی کارکردگی کا ذکر کیا، اور کہا کہ

"میری خواہش ہے کہ اس شعبے کو زیادہ سے زیادہ ترقی کرنی چاہیئے۔ پاکستان اور اردو زبان و ادب کے بارے میں یہاں تحقیقی کام کرنے کی بھی ضرورت ہے۔ مجھے یقین ہے کہ آپ کی موجودگی میں یہ کام تیزی سے ہوگا"۔

یہ باتیں ہو رہی تھیں کہ ٹیلی فون کی گھنٹی بجی۔ ڈاکٹر طارق سومر ٹیلی فون سُننے کے لئے اپنی میز پر گئے۔ چند منٹ باتیں کر کے واپس آئے اور صوفے پر بیٹھ کر کہنے لگے "یہ ہوم گورنمنٹ کا فون تھا۔ یعنی میری بیوی کا۔ کچھ فرمائشیں کی گئی ہیں۔ جب کوئی فرمائش

ہوتی ہے تو کسی وقت بھی فون آسکتا ہے۔ کیا پاکستان میں بھی یہی سب کچھ ہوتا ہے؟"
میں نے کہا "جناب! اس معاملے میں ملکوں اور معاشروں کی کوئی قید نہیں۔ ہوم گورنمنٹ کے ٹیلی فون تو ہر ملک میں اسی طرح آتے ہیں۔ فرمائشیں بھی اسی طرح ہوتی ہیں۔ پاکستان میں بھی یہی سب کچھ ہوتا ہے ــــ بلکہ اس سے کچھ زیادہ ہی ہوتا ہے۔"
یہ بات سن کر ڈاکٹر طارق سومر بہت ہنسے۔ اُن کے مزاج میں بذلہ سنجی بہت تھی۔ قہقہے خوب لگاتے تھے۔
تقریباً گھنٹہ ڈیڑھ گھنٹہ ہمارے ساتھ باتیں کرتے رہے۔ پھر کہنے لگے "آج یہاں ہمارے دفتر میں ترک مصوری کے شاہکاروں کی نمائش کا افتتاح ہونے والا ہے۔ آپ لوگ بھی میرے مہمان کی حیثیت سے اس تقریب میں شرکت کیجیے۔"
ہم نے اُن کا شکریہ ادا کیا، اور اُن کے ساتھ ایک بڑے ہال میں گئے جہاں ترکی مصوری کے شاہکار بڑے سلیقے سے نمائش کے لئے رکھے گئے تھے۔ ہم نے ڈاکٹر طارق سومر کے ساتھ ترکی کے مصوروں کی تصویریں دیکھیں اور اُن کی فن کارانہ صلاحیتوں کی داد دی۔ بہت اچھا وقت گذرا۔
نمائش میں رنگ رنگ کے مشروبات کا بھی اہتمام کیا گیا تھا۔ ایک میز پر اِن مشروبات کی بوتلیں اپنی بہار دکھا رہی تھیں۔ لیکن ہم لوگ اِن میں سے بہت سے مشروبات سے محروم تھے۔ اس لئے ڈاکٹر طارق سومر نے اپنے ہاتھ سے مالٹے اور سنترے کا رس ہمارے لئے گلاسوں میں ڈالا ، اور اُن سے یہ کہہ کر ہماری تواضع کی کہ "ہم لوگوں کی قسمت میں یہی ہلکے پھلکے مشروبات لکھے ہیں۔ تیز چیزیں ہمارے مقدر میں نہیں ہیں۔"
میں اُن کی اِن باتوں سے بہت محظوظ ہوا۔
اب رات ہو چکی تھی۔ اندھیرے پھیل گئے تھے۔ اس لئے میں نے، پروفیسر ملیحہ خانم صاحبہ نے اور ڈاکٹر شوکت بولو صاحب نے ان سے اجازت لی، اور یونیورسٹی کی گاڑی میں اپنی اپنی جائے قیام کی طرف روانہ ہوئے۔
ڈاکٹر طارق سومر نے ہمیں بڑے ہی احترام، محبت اور تپاک سے رخصت کیا۔

انقرہ میں میرا تعلق پاکستانی سفارت خانے سے تھا۔اس لیئے سفارت خانے کی مختلف تقریبات میں مجھے خاص طور پر دعوت دی جاتی تھی۔ڈاکٹر طارق سومر بھی ان تقریبات میں باقاعدگی سے شریک ہوتے تھے، اور مجھ سے خصوصیت کے ساتھ دلچسپ باتیں کرتے تھے۔

ایک دن یوم پاکستان کی تقریب میں ملے تو پاکستان میں سائنس کی ترقی کے بارے میں باتیں ہونے لگیں۔

کہنے لگے" ترکی کے تمام لوگ پاکستان پر فخر کرتے ہیں۔اس لیئے کہ پاکستان نے سائنس کی دُنیا میں بڑی ترقی کی ہے۔خاص طور پر نیوکلیر ریسرچ میں جو کارنامے پاکستان کے سائنس دانوں نے انجام دیئے ہیں وہ تیسری دُنیا کی تاریخ میں سُنہرے حروف میں لکھے جانے کے قابل ہیں۔میں سائنس کا طالب علم ہوں، اور اس حیثیت سے میں وثوق کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ اتنے قلیل عرصے میں ایسا اہم کام کسی اور ملک نے نہیں کیا"۔

میں نے کہا"ترکی کی ترقی بھی سائنس اور ٹیکنالوجی میں حیرت انگیز ہے"۔

کہنے لگے"یہ بھی اپنی جگہ صحیح ہے لیکن ہم لوگ پاکستان پر فخر کرتے ہیں"۔

غرض دیر تک پروفیسر طارق سومر اس طرح کی باتیں کرتے رہے۔ان باتوں میں پاکستان کی محبت اور اس برادر ملک کے ساتھ والہانہ شیفتگی کی خوشبو تھی۔

پھر کہنے لگے"میں کئی بار پاکستان گیا ہوں۔مجھے اس مُلک کی ہر بات پسند ہے۔وہاں کے مناظر، وہاں کے شہر اور دیہات، وہاں کے لوگ جن کی سادگی میں حُسن اور حُسن میں سادگی ہے۔میں تقریباً تمام دُنیا کے ملکوں میں گیا ہوں لیکن جو بات میں نے پاکستان میں دیکھی ہے، وہ مجھے کہیں اور نظر نہیں آئی"۔

میں نے کہا"یہ سب آپ کی محبت اور شیفتگی کا کرشمہ ہے"۔

ڈاکٹر طارق سومر کہنے لگے"۔ اور پھر پاکستان میں کھانے کی چیزیں بہت عمدہ ہیں۔خاص طور پر وہاں کی روٹی جس میں خمیر نہیں ڈالا جاتا۔ہمارے ہاں ترکی میں تو روٹی بغیر خمیر کے تیار نہیں ہوتی۔مجھے خمیر بالکل پسند نہیں ہے۔اس سے گندم کا مزہ بدل جاتا ہے"۔

میں نے کہا "لیکن ترکی کی روٹی اکمک تو بہت ہی مزے دار ہوتی ہے۔ میں اس کو بڑے شوق سے کھاتا ہوں۔ اور پھر اس نے تو یہاں روٹی کا مسئلہ بھی حل کر دیا ہے۔ یہ غازی مصطفےٰ کمال پاشا اتاترک کا کارنامہ ہے"۔

ڈاکٹر طارق سومر نے میرے اس خیال سے اتفاق کیا۔ لیکن اپنے اس موقف پر قائم رہے کہ پاکستان کی چپاتی کا کوئی جواب نہیں۔

انقرہ یونیورسٹی کے دوران قیام میں ایک دفعہ ڈاکٹر طارق سومر مجھے اپنے ساتھ ترکی کے ایک دور اُفتادہ شہر کاستومونو لے گئے۔ وہاں انقرہ یونیورسٹی کی کچھ تقریبات میں ہم نے شرکت کی۔ اس شہر میں پاکستان سے جو محبت میں نے دیکھی وہ مجھے کہیں اور نظر نہیں آئی۔ دو تین دن ہم لوگ کاستومونو میں رہے، اور ان دو تین دنوں میں اپنی مصروفیات کے باوجود ڈاکٹر طارق سومر نے مجھے وہاں کے خوبصورت مناظر دکھائے۔ قدیم تاریخی مقامات کی سیر کرائی، مسلمانوں کے مقدس مقامات اور بڑے بڑے خدا رسیدہ بزرگوں اور ولیوں عاشق ولی اور شعبان ولی کے مزاروں کی زیارت بھی کرائی۔ اور ایک دُور افتادہ گاؤں میں بھی لے گئے جہاں کے رہنے والوں نے ہمارے ساتھ ایسی محبت کا اظہار کیا جو مجھے کہیں اور نصیب نہیں ہوئی۔

کاستومونو کا مختصر قیام میرے لئے اور میری اہلیہ کے لئے ڈاکٹر طارق سومر کی وجہ سے ایک نہایت ہی خوش گوار تجربہ تھا۔

ڈاکٹر طارق سومر پاکستان کے عاشق ہیں اور بڑے ہی مہمان نواز انسان ہیں۔ میں شروع شروع جب انقرہ پہنچا تو انقرہ یونیورسٹی کے مہمان خانے میں میرے قیام کا انتظام کیا جہاں میرا وقت بہت اچھا گذرا، اور جب میں اپنے مکان میں منتقل ہوا، اور میں نے مہمان خانے کا بل ادا کرنے کے لئے کہا تو مجھے اُس کے عملے نے یہ اطلاع دی کہ ڈاکٹر طارق سومر نے بل نہ لینے کی ہدایت کی ہے کیونکہ میں اُن کا مہمان ہوں۔

میں انقرہ یونیورسٹی میں اُردو زبان و ادب اور مطالعۂ پاکستان کے پروفیسر کی حیثیت سے تقریباً تین سال رہا۔ وہاں محبت اور یگانگت کی فضا میں میرا وقت بہت

اچھا گذرا۔ ڈاکٹر طارق سومر، پروفیسر ملیحہ خانم صاحبہ اور ڈاکٹر شوکت بولو کی یہ خواہش تھی کہ میں مستقل طور پر وہاں رہوں لیکن لاہور میں میرے علمی ادبی کام نے مجھے اس کی اجازت نہیں دی۔ اس لئے میں انقرہ یونیورسٹی میں تقریباً تین سال گذارنے کے بعد مجبوراً یہاں واپس آکر اپنے علمی کاموں میں مصروف ہوگیا۔

ترکی میں تقریباً تین سال میں نے شفقت اور محبت کے ماحول میں گذارے، اور اس زمانے میں ڈاکٹر طارق سومر کی دلکش و دل آویز شخصیت نے میرے لئے، ہمیشہ وہ کام کیا جو میرے گھر کے صحن میں چھٹکی ہوئی چاندنی کا حُسن و جمال اور نسیم سحر کا خرام دل نواز کرتا ہے۔

میں انہیں یاد کرتا ہوں اور اُن کی بہار آفریں شخصیت کی یاد دل نواز میرے دل میں آج بھی دھومیں سی مچاتی ہے۔

ڈاکٹر شوکت بولو

حکومتِ پاکستان کی طرف سے جب مجھے انقرہ یونیورسٹی میں اُردو اور پاکستان کی تہذیب و ثقافت کی پروفیسری کا آفر ملا تو پہلے تو میں نے معذرت کی لیکن جب حکومت نے اصرار کیا تو میں نے ترکی اور پاکستان کے برادرانہ تعلقات کے پیشِ نظر اس کو قبول کر لیا۔ تقریباً تین سال پروفیسر کی حیثیت سے میں نے انقرہ یونیورسٹی میں گذارے اور مجھے وہاں کے پروفیسروں، طالب علموں اور انقرہ کے شہریوں کی طرف سے ایسی عزت اور محبت ملی جس کو میں کبھی بھلا نہیں سکتا۔

جب میں پروفیسر کی حیثیت سے اپنی یہ نئی ذمہ داریاں سنبھالنے کے لئے انقرہ پہنچا، اور ہوائی اڈے سے باہر نکلا تو سب سے پہلے مجھے ایک صاحب ملے جن کے ہاتھ میں پھول تھے۔ اُن کے ساتھ لڑکیاں اور لڑکے بھی تھے جن میں سے ہر ایک نے ہاتھوں میں پھولوں کے گلدستے اُٹھا رکھے تھے۔

یہ سب شعبۂ اُردو انقرہ یونیورسٹی کے استاد اور طالب علم تھے جو میرے استقبال کے لئے ہوائی اڈے پر آئے تھے۔ خدا جانے کس طرح ان لوگوں نے مجھے پہچان لیا، اِن میں سے ایک صاحب نے، جو صورت سے اُستاد معلوم ہوتے تھے، آگے بڑھ کر مجھ سے معانقہ کیا، اور کہا کہ "میں انقرہ یونیورسٹی کے شعبۂ اُردو میں اُردو اور مطالعۂ پاکستان کا اُستاد ہوں۔ یہ

لڑکے لڑکیاں سب آپ کے طالب علم ہیں۔ ہم آپ کے استقبال کے لئے آئے ہیں۔ مرحبا! خوش آمدید!"

میں نے کہا "آپ لوگوں کو بڑی زحمت ہوئی۔ اتنی دور سے آپ یہاں آئے۔ آپ سب کا شکریہ کس طرح ادا کروں"؟

یہ صاحب ڈاکٹر شوکت بو بو تھے جو اپنے طالب علموں کے ساتھ قسم قسم کے پھولوں کے گلدستے لے کر مجھ سے ملنے اور مجھے خوش آمدید کہنے کے لئے ہوائی اڈے پر آئے تھے۔

میں نے شوکت صاحب سے پوچھا "آپ کو میرے یہاں پہنچنے کا علم کیسے ہوا؟ اور آپ نے مجھے پہچانا کیسے"؟

شوکت صاحب نے کہا "پاکستان کے سفارت خانے سے ہم لوگوں کو آپ کے آنے کی تاریخ اور وقت کا علم ہو گیا تھا۔ اس لئے ہم یہاں صحیح وقت پر پہنچ گئے۔ میرا نام شوکت بو بو ہے۔ میں چند سال لاہور میں ایک طالب علم کی حیثیت سے رہ چکا ہوں۔ آپ کو لاہور میں دیکھا تھا۔ اس لئے خوب جانتا اور پہچانتا ہوں۔ اس زمانے میں آپ وہاں اردو کے پروفیسر، اورینٹل فیکلٹی کے ڈین اور اورینٹل کالج کے پرنسپل تھے۔ میں اسلامیات کے شعبے میں تھا۔ اس لئے آپ سے ملاقات تو نہ ہو سکی لیکن آپ کو کئی بار اورینٹل کالج میں دیکھا ضرور۔ بعض لوگوں نے یہ کہا کہ آپ بہت مصروف رہتے ہیں۔ آپ کے پاس وقت نہیں ہے۔ اس لئے میں نے ملنے کی کوشش نہیں کی"۔

میں نے کہا "افسوس ہے کہ لاہور میں آپ سے ملاقات نہ ہو سکی۔ ایسی بھی کیا مصروفیت! آپ کو مجھ سے ملنا چاہیئے تھا۔ لوگوں نے غلط بیانی کی۔ میں تو ہر ایک سے ملتا تھا۔ میرے دروازے تو سب کے لئے کھلے رہتے تھے۔ خاص طور پر بیرونی ملکوں سے آنے والوں سے مل کر مجھے بہت خوشی ہوئی تھی۔ خیر اب ملاقات ہو گئی۔ دیر آید درست آید اور اب انشاء اللہ کئی سال تک روزانہ ملاقاتیں ہوتی رہیں گی"۔

یہ چند باتیں کرتے ہوئے ہم لوگ ہوائی اڈے کی عمارت سے باہر نکلے جہاں سفارت خانے کی ایک بڑی سی گاڑی ہمارا انتظار کر رہی تھی۔

شوکت صاحب نے مجھے اس گاڑی میں بٹھایا۔ لڑکے لڑکیاں دوسری گاڑی میں بیٹھے اور کوئی ایک گھنٹے میں تقریباً بیس میل کا راستہ طے کر کے ہم لوگ بینے حاتون جدّیسی پر انقرہ یونیورسٹی کے مہمان خانے میں پہنچے۔ ترکی زبان میں اس مہمان خانے کو کونک ایوی کہتے ہیں۔ شوکت صاحب نے اس مہمان خانے کی تیسری منزل کے ایک کمرے میں میرا سامان رکھوایا۔ تھوڑی دیر بیٹھے۔ پھر ہر چیز کو سلیقے سے رکھا، اور پھر کہا "استاد محترم! چلیئے کھانا کھا لیجئے"۔

ہم نے ترکی کھانا کھایا، اور پھر اپنے کمرے میں آئے۔ اب سہ پہر کا وقت ہو چکا تھا۔ اس لئے شوکت صاحب تو یہ کہہ کر رخصت ہوئے کہ "اب آپ آرام کیجئے۔ میں رات کو پھر آؤں گا، اور آپ کو کھانے کے لئے باہر کسی ریستوراں میں لے چلوں گا"۔

شوکت صاحب کے جانے کے بعد میں ذرا دیر کے لئے لیٹ گیا۔ آنکھ لگ گئی۔ اٹھا تو مغرب کا وقت ہو چکا تھا۔ تھوڑی دیر میں شوکت صاحب پھر آگئے۔ دیر تک باتیں ہوتی رہیں، اور پھر ہم لوگ کزلائی کے ایک ریستوران میں کھانا کھانے کے لئے باہر نکلے۔ پہلے تو انہوں نے مجھے انقرہ کے بازار کزلائی کی سیر کرائی، پھر ایک ریستوران میں کھانا کھلایا، اور پھر رات گئے مجھے میری جائے قیام پر پہنچا کر گھر واپس گئے۔

جب وہ رخصت ہونے لگے تو میں نے کہا "شوکت صاحب! اگر یہی لیل و نہار رہے اور شب و روز اسی طرح اگر آپ کو میری مہمان نوازی میں مصروف رہنا پڑا تو مجھے یقین ہے کہ آپ کی بیگم اور بچّے ضرور باغی ہو جائیں گے۔ آخر اُن کا بھی تو کچھ حق ہے"!

شوکت صاحب نے کہا "میں نے اس کی پیش بندی کر دی ہے۔ اُنہیں سمجھا دیا ہے، اور یہ کہہ دیا ہے کہ پاکستان سے مہمان پروفیسر ڈاکٹر عبادت آئے ہوئے ہیں۔ میں اُن کے ساتھ مصروف ہوں"۔

یہ باتیں کر کے اُنہوں نے مجھے اپنے کمرے میں پہنچایا۔ چند منٹ بیٹھے، کمرے کا جائزہ لیا۔ اور دس بجے کے بعد واپس اپنے گھر چلے گئے۔

چلتے وقت کہنے لگے "انشاء اللہ صبح کو پھر ملاقات ہوگی۔ آٹھ بجے کے قریب آپ ناشتہ

کر لیجیئے گا۔ یہاں ناشتے کا معقول انتظام ہے۔ میں نو بجے کے بعد آؤں گا۔ پھر ہم لوگ یونیورسٹی چلیں گے۔ دن کا کھانا وہیں کھائیں گے۔ پروفیسروں سے ملیں گے۔ ریکٹر ڈاکٹر طارق سومر سے بھی کل سہ پہر کو مُلاقات ہوگی۔ میں نے انہیں فون کر دیا ہے۔ وہ چار بجے ہمارا انتظار کریں گے۔"

صبح کو آٹھ بجے میں نے مہمان خانے میں ناشتہ کیا۔ ایک خاتون گلشن اور مہمان خانے کے نگران حسن نے بڑی شفقت اور محبت سے مجھے ناشتہ کروایا۔ نو بجے شوکت صاحب آگئے، اور مجھے یونیورسٹی لے گئے۔ اپنے کمرے میں پہنچے۔ مجھے بڑی محبت سے بٹھایا، اور نو زاد کو بلا کر کہا "نو زاد چائے۔" نو زاد فوراً بغیر دودھ کی خالص ترکی چائے کے دو بروک (فنجان) لے آیا۔ ہم نے وہ تلخ چائے پی۔ پھر اُنہوں نے دو تین ٹیلی فون کئے۔ چند منٹ کے بعد فارسی کی پروفیسر اور مشرقی علوم اور اسلامیات کے شعبے کی صدر ملیحہ خانم آگئیں شوکت صاحب نے اُن سے میرا تعارف کروایا، اور وہ خاصی دیر تک ہم سے باتیں کرتی رہیں۔ انگریزی اور فارسی دونوں زبانیں روانی سے بولتی تھیں۔

کہنے لگیں۔ "میں پاکستان اور علامہ اقبالؒ کی شیدائی ہوں۔ علامہ اقبالؒ کے جشن صد سالہ کے موقع پر ۱۹۷۷ء میں میں لاہور گئی تھی۔ آپ سے بھی مُلاقات ہوئی تھی۔ لاہور خوب شہر ہے!"

میں نے کہا "جی ہاں! مجھے اچھی طرح یاد ہے۔ آپ ترکی کے وفد کے ساتھ لاہور تشریف لائی تھیں، آپ سے مُلاقات ہوئی تھی۔ آپ نے مقالہ بھی پڑھا تھا۔"

تقریباً آدھ گھنٹے وہ ہمارے ساتھ باتیں کرتی رہیں۔ پھر شوکت صاحب کو مخاطب کر کے کہنے لگیں۔ "میں ذرا پروفیسر صاحب کے کمرے کو دیکھ لوں۔ فرنیچر وغیرہ تو میں نے کل ہی لگوا دیا تھا۔ اطمینان کر لوں کہ کمرہ ٹھیک ہو گیا ہے۔"

یہ کہہ کر وہ چلی گئیں۔ میرا کمرہ دیکھا، اور پھر اپنے دفتر میں جا کر کام کرنے لگیں"۔
میں شوکت صاحب سے اُن کے کمرے میں باتیں کرتا رہا۔
شوکت صاحب کا کمرہ چھوٹا تھا لیکن کتابوں سے بھرا ہوا تھا۔ الماریوں میں کتابیں،

میز پر کتابیں، سوائے کتابوں کے اس کمرے میں کچھ نہیں تھا۔ شوکت صاحب نو بجے کے قریب اس کمرے میں آجاتے تھے اور دن بھر یہاں پڑھتے لکھتے اور ٹائپ کرتے رہتے تھے۔ جب اُن کا لیکچر ہوتا تھا تو وہ لیکچر روم میں جاتے تھے، اور واپس آکر پھر اپنے اسی کمرے میں مصروف ہو جاتے تھے۔

آج فیکلٹی میں میرا پہلا دن تھا۔ اس لئے، ہم نے لیکچروں کا پروگرام بنایا، اور جب بارہ بجے تو شوکت صاحب نے کہا "چلئے کھانا کھا لیجیے"۔

میں اُن کے ساتھ ڈائننگ ہال میں گیا جہاں پروفیسروں کے لئے کھانے کا انتظام تھا۔ ہم نے کھانا لیا، شوکت صاحب نے دو سو لیرا کا بل ادا کیا، اور کھانا کھایا۔ پھر اپنے کمرے میں واپس آکر چائے پی۔ اور باتیں کرتے رہے۔

چار بجے ہم لوگ یونیورسٹی کی گاڑی میں ملیحہ خانم صاحبہ کے ساتھ ریکٹر کے دفتر گئے اور ڈاکٹر طارق سومر سے ملاقات کی۔ ڈیڑھ گھنٹہ اُن کے ساتھ رہے۔ مغرب کے بعد شوکت صاحب اور ملیحہ خانم صاحبہ نے مجھے میری جائے قیام پر کونک ایوی پہنچایا۔

دوسرے دن صبح کو پھر شوکت صاحب نو بجے کے قریب میرے پاس آئے اور مجھے فیکلٹی لے گئے۔ باتیں ہوئیں کام کرنے کا پروگرام بنایا گیا، چائے پی گئی، کھانا کھایا گیا۔ بل شوکت صاحب ہی نے اصرار کر کے ادا کیا۔ جتنے دن میں انقرہ میں رہا شوکت صاحب کے اس انداز میں فرق نہیں آیا۔

ایک دن میں نے اُن سے کہا "جناب! مہمانی تین چار دن کی ٹھیک ہوتی ہے۔ اب بل مجھے بھی دینے دیجیے"، لیکن انہوں نے یہ کہہ کر میری اس تجویز کو رد کر دیا کہ "آپ تو ہمارے مہمان ہیں۔ بل ادا کرنے کی بات نہ کیجیے"۔

میں شروع شروع میں اکیلا انقرہ گیا تھا۔ گھر والے کئی مہینے کی تاخیر سے آئے۔ اس عرصے میں شوکت صاحب نے ہمیشہ میرا خیال رکھا، اور تنہائی کے عذاب سے مجھے نجات دلائی۔ شام کو بھی وہ اکثر میرے پاس آجاتے تھے، اور اصرار کر کے کسی اچھے سے ریستوراں میں مجھے کھانا کھلاتے اور بل خود ادا کرتے تھے۔

جب بھی میں بل دینے کی کوشش کرتا تو وہ کہتے "آپ تو ہمارے مہمان ہیں۔ بل مہمان ادا نہیں کرتا۔ میزبان ادا کرتا ہے۔ پاکستان اور ترکی دونوں کی روایت یہی ہے"۔

یہ سُن کر میں نے کہا "شوکت صاحب! میں آخر کب تک مہمان رہوں گا۔ اب تو خاصا زمانہ گذر گیا ہے۔ مہمان تو دو چار دن کا ہوتا ہے"۔

کہنے لگے "آپ کی بات صحیح ہے لیکن ابھی تو آپ تنہا ہیں۔ اس لئے آپ کا مہمان رہنا ہی مناسب ہے۔ جب آپ کے گھر والے آجائیں گے تو اس پر غور کیا جائے گا"۔

میں اِن باتوں کو سُن کر چُپ ہو جاتا۔ ضد کرتا تو محبت اور خلوص کو ٹھیس لگ جاتی۔ اور اس کے لئے میں تیار نہیں تھا۔

ترکی کے دوران قیام میں میرا یہ معمول تھا کہ میں صبح دس بجے کے قریب فیکلٹی میں پہنچتا۔ سیدھا شوکت صاحب کے کمرے میں جاتا۔ چائے پیتا، اور تھوڑی دیر اُن سے باتیں کرتا۔ پھر دس بجے لیکچر دینے کے لئے لیکچر روم میں جاتا۔

چلتے وقت وہ کہتے "کوئی حُکم، میرے لئے کوئی خدمت؟"

اور میں اُن سے کہتا "آپ سے مُلاقات اور دلچسپ باتیں"۔

شوکت صاحب کہتے "بارہ بجے میں آپ کے کمرے میں حاضر ہوں گا۔ پھر کھانا کھانے چلیں گے"۔

بارہ بجے وہ میرے کمرے میں آتے، اور کہتے "چلیئے۔ کھانا کھائیں گے، پھر واپس آ کر چائے پیئیں گے اس کے بعد کام کریں گے"۔

برسوں شوکت صاحب کا یہی معمول رہا۔

شوکت صاحب کو معلوم تھا کہ میں جذباتی سا آدمی ہوں۔ انقرہ میں اپنے گھر والوں کے نہ ہونے کی وجہ سے تنہائی محسوس کرتا ہوں اس لئے ہفتے اور اتوار کو چھٹی کے دن بھی وہ میرے پاس آجاتے تھے۔ کئی دفعہ تو ایسا ہوا کہ وہ مجھے انقرہ سے باہر بعض پہاڑی مقامات پر پک نک کے لئے بھی لے گئے "جہاں اختتام ہفتہ (ویک اینڈ) کے دن گذار کر ہم واپس انقرہ آئے اس کا مقصد صرف میرا دل بہلانا اور تنہائی کے عذاب سے

مجھے نجات دلانا تھا۔

شوکت صاحب کے ایسے مخلص اور محبت کرنے والے لوگ میں نے زندگی میں کم ہی دیکھے ہیں۔

شوکت صاحب پاکستان کے عاشق تھے، اُن کی زندگی کا مقصد پاکستان اور اُردو زبان کی خدمت تھا۔ یونیورسٹی میں اُن کی بڑی عزت تھی کیونکہ وہ اُردو زبان و ادب اور پاکستان کی تاریخ اور تہذیب و ثقافت کے عالم تھے، اور پاکستان کے شعبے کو انہوں نے انقرہ یونیورسٹی کا سب سے بڑا اور اہم شعبہ بنا دیا تھا۔ اس شعبے میں طالب علموں کی تعداد اُن کی وجہ سے ایک ہزار کے لگ بھگ ہو گئی تھی۔ سات سو کے قریب پاکستان کی تاریخ اور تہذیب و ثقافت کے اور تین سو کے قریب اُردو زبان و ادب کے طالب علم تھے۔ دوسرے شعبوں کے اساتذہ کو اس شعبے پر رشک آتا تھا کیونکہ دوسرے شعبوں میں طالب علموں کی تعداد بہت کم تھی۔ طالب علموں کی تعداد بڑھانے کا سہرا شوکت صاحب کے سر تھا۔ پڑھانے کا کام زیادہ تر شوکت صاحب خود کرتے تھے۔ اُن کی مصروفیت کا یہ عالم تھا کہ وہ صبح کو نو بجے شعبے میں آجاتے تھے، اور پھر شام تک تدریس و تحقیق کے کاموں میں مصروف رہتے تھے۔ پڑھانے کا خاصا بوجھ انہوں نے اُٹھا رکھا تھا۔ لیکن جذبِ صادق کی بدولت وہ یہ کام بڑے شوق سے کرتے تھے۔

میں انقرہ پہنچا تو میں نے تدریس کے کاموں میں اُن کا ہاتھ بٹایا۔ اُردو زبان و ادب پڑھانے کا زیادہ کام میں نے اپنے ذمے لیا، اور اس طرح شوکت صاحب کا بوجھ تو کچھ ہلکا ہو گیا لیکن اُن کی مصروفیت کم نہ ہوئی۔ انقرہ یونیورسٹی میں انتظامی کام بھی خاصا تھا، اور شوکت صاحب اِن کاموں کے لئے خاصا وقت دیتے تھے۔ اس کے علاوہ علمی اور تحقیقی کام بھی وہ شعبے ہی میں بیٹھ کر کرتے تھے۔ مشغول رہنا اُن کا معمول تھا۔ بڑے محنتی آدمی تھے۔ میں نے انہیں کبھی بیکار بیٹھے ہوئے یا بیکار باتوں میں وقت ضائع کرتے ہوئے نہیں دیکھا۔

شوکت صاحب نہایت شفیق اُستاد تھے لیکن جو طالب علم محنت نہیں کرتے تھے۔ اُن کے ساتھ سختی روا رکھتے تھے۔ طلباء و طالبات کو بڑی شفقت اور محبت سے پڑھاتے

تھے۔ اپنی قیمتی کتابیں تک انہیں دے دیتے تھے۔ اُن کی فلاح و بہبود کا بھی انہیں خیال رہتا تھا۔ لیکن طالب علموں کو شیر کی آنکھ سے دیکھتے تھے۔ بولو ترکی زبان میں شیر کو کہتے ہیں۔ وہ واقعی شیر تھے۔

ایک دن میں اُن کے کمرے میں بیٹھا ہوا تھا کہ دروازے پر دستک ہوئی، اور کچھ لڑکیاں اُن کے کمرے میں داخل ہوئیں، اور ترکی میں کچھ کہا جس کو میں نہ سمجھ سکا۔ شوکت صاحب نے کئی دفعہ اِن لڑکیوں سے کہا "گِت، گِت (یعنی چلی جاؤ!)"

یہ سُن کر وہ چلی گئیں۔

میں نے اُن سے پوچھا "آپ نے اِن لڑکیوں کو باہر کیوں نکال دیا؟"

کہنے لگے "یہ کام نہیں کرتیں۔ وقت ضائع کرتی ہیں۔ اس لئے میں انہیں احساس دلاتا ہوں تاکہ اپنا اور میرا وقت ضائع نہ کریں۔"

میں طالب علموں کے معاملے میں نرم اُستاد تھا۔ اس لئے مجھے یہ بات کچھ عجیب سی معلوم ہوئی۔ میں نے کہا "ایسے طالب علموں کو آپ میرے پاس بھیج دیا کیجئے۔ میں انہیں ٹھیک کر لوں گا۔ یہ کام مجھے خوب آتا ہے۔"

چنانچہ ایسے تمام طالب علم میرے پاس آنے لگے، اور میں اُن کے مسائل کو حل کرنے لگا، اور اس میں مجھے خاصی کامیابی ہوئی۔

میرے اس رویے کو دیکھ کر شوکت صاحب کی سختی خود بخود نرمی میں تبدیل ہوگئی، جس کے نتیجے میں طالب علم خوش نظر آنے لگے۔ اور اس طرح شعبے میں ایک مانوس سی فضا پیدا ہوئی۔

پاکستان اور ترکی کے تعلقات ہمیشہ سے برادرانہ رہے ہیں۔ شوکت صاحب اپنے طالب علموں کو اس کا احساس دلاتے تھے، اور اُن کے اس رویے نے تمام ترک طالب علموں کو پاکستان کا عاشق بنا دیا تھا۔ وہ پاکستان کو اپنے خوابوں کی سرزمین سمجھنے لگے تھے، اور اُن میں سے ہر ایک کی یہ خواہش تھی کہ وہ پاکستان جائیں۔ اس سرزمین مینو سواد کی سیر کریں۔ لوگوں سے ملیں اور وہاں رہ کر علمی کام کریں۔

شوکت صاحب اُردو زبان وادب اور پاکستان کی تاریخ اور تہذیب وثقافت کے ماہر تھے۔ اُنھوں نے اپنی ڈاکٹریٹ کے لئے اُردو نثر پر پروفیسر طاہر فاروقی صاحب مرحوم کی نگرانی قابل قدر کام کیا تھا اُن کا یہ تحقیقی مقالہ ترکی زبان میں ہے۔ اس لئے اُردو دانوں تک اس کی رسائی ممکن نہ ہوسکی۔ میں نے جب اُن کا یہ مقالہ دیکھا تو میں اُن کے وسیع مطالعے اور اَن تھک محنت کا قائل ہوگیا، اور میں نے یونیورسٹی کے ڈین اور ریکٹر کو خط لکھ کر یہ سفارش کی کہ شوکت صاحب کو اُردو کا۔ پروفیسر یا کم ازکم ایسوسی ایٹ پروفیسر ضرور بنا دیا جائے۔ چنانچہ وہ میری سفارش پر ایسوسی ایٹ پروفیسر بنا دیئے گئے اور اس سے انقرہ یونیورسٹی کے شعبۂ اردو کو بہت فائدہ ہوا۔

اب شعبے میں پوسٹ گریجویٹ جماعتیں بھی کھول دی گئیں، اور ساتھ ہی ڈاکٹریٹ کے لئے تحقیق کا کام بھی ہونے لگا۔ دو ترک خواتین سلمیٰ اور گُل زرین لیکچرار بھی بنا دی گئیں۔ اور یہ سب کچھ شوکت صاحب کا کارنامہ تھا۔

شوکت صاحب اسلامیات کے ماہر بھی تھے۔ لیکن آزاد خیال مسلمان تھے۔ غازی مصطفےٰ کمال پاشا اتاترک کے خیالات ونظریات سے انہیں گہری دلچسپی تھی، اور وہ اُن پر عمل بھی کرتے تھے۔ روشن خیالی اُن میں کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی۔ وہ عقلیت پرستی کے قائل تھے۔ لیکن بعض معاملات میں اُن کے مزاج میں خاصی قدامت پرستی تھی خاص طور پر لڑکوں اور لڑکیوں کے بے باکی کے ساتھ ملنے جُلنے کو اچھا نہیں سمجھتے تھے۔ کہتے کچھ نہیں تھے کیونکہ ترکی میں اس پر کوئی خاص پابندی نہیں تھی۔ لیکن یونیورسٹی کے ماحول کو دیکھ کر کبھی کبھی دبی زبان سے یہ کہتے ضرور تھے کہ "یہ لوگ عشق کرتے ہیں، وقت ضائع کرتے ہیں ــ اس کا فائدہ کوئی نہیں"۔

اور اُن کی یہ بات سُن کر میں سُنی ان سُنی کر دیتا تھا۔ البتہ کبھی کبھی صرف اتنا کہہ دیتا تھا کہ "شوکت صاحب! یہ کاروبار تو کبھی رُکا نہیں ہے۔ یہ تو دل کی باتیں ہیں۔ جوانی کا تقاضا ہے"۔

اور یہ سُن کر وہ مُسکرا دیتے تھے۔

اُن کے مزاج میں سنجیدگی بہت تھی۔کم آمیز بھی تھے۔کبھی کسی سے بے تکلف نہیں ہوتے تھے۔خاص طور پر طالب علموں کے سامنے تو وہ کبھی ہنستے اور مسکراتے تک نہیں تھے۔بلکہ جو اساتذہ طالب علموں سے بے تکلفی کا برتاؤ کرتے تھے اُن پر سخت تنقید کرتے تھے اور کہتے تھے کہ یہ لوگ طالب علموں سے بے تکلف ہو کر اس پیشے کے تقدس کو مجروح کرتے ہیں اور یہ اچھی بات نہیں ہے۔"

ویسے اس سنجیدگی اور سخت گیری کے باوجود وہ انسان دوست تھے۔کسی سے کوئی غلطی ہو جائے تو اس کو معاف کر دیتے تھے۔انسان کی کمزوریوں اور کوتاہیوں کا احساس رکھتے تھے، اور ہمیشہ عفو و درگذر سے کام لیتے تھے۔انسان کی مجبوریوں کا بھی انہیں شدید احساس تھا۔

شعبۂ اُردو کے چپراسی نوزاد کو تنخواہ کم ملتی تھی، لیکن اس کے اخراجات زیادہ تھے۔وہ شعبے میں چائے بناتا تھا اور جو لوگ اس کی بنائی ہوئی چائے پیتے تھے، وہ اس کو کچھ پیسے دے دیتے تھے۔یونیورسٹی کی طرف سے اس طرح چائے بنانے کی اجازت نہیں تھی۔لیکن شوکت صاحب اس سے چشم پوشی کرتے تھے، اور اکثر مجھ سے کہتے تھے "نوزاد کے کئی بچے ہیں۔تنخواہ میں اس کی گذر بسر نہیں ہوتی۔اس لیئے چائے سے اس کو کچھ مزید آمدنی ہو جاتی ہے۔اس لیئے میں چشم پوشی کرتا ہوں۔"

اور میں اُن کی یہ باتیں سُن کر اُن کی انسان دوستی کی داد دیتا تھا۔ایسے لوگ آج کل کہاں ملتے ہیں۔

تقریباً تین اکیڈمک سیشن میں نے انقرہ یونیورسٹی میں اُن کے ساتھ گذارے، اور میں اُن کی باقاعدگی، سنجیدگی، علم دوستی، اخلاص، اَن تھک محنت، کام کرنے کی دُھن اور لگن سے بہت متاثر ہوا۔اُن کی خواہش تھی کہ میں اور کئی سال انقرہ یونیورسٹی میں اُن کے ساتھ گذاروں لیکن لاہور مجھے اپنی طرف کھینچ رہا تھا، اور میرے ادھورے علمی ادبی کام مجھے اپنی طرف بُلا رہے تھے۔چنانچہ مجبوراً تین سال کے بعد مجھے اُن کا ساتھ چھوڑنا پڑا۔

اوراب وہ مجھے اور میں انہیں یاد کرتا ہوں - ہر لمحہ اُن کی یاد بادِ نسیم صبح بہار بن کر، میرے دل کو لبھاتی، اور حواس پر سرخوشی بن کر چھائی رہتی ہے - اور اس دُعا کے لئے ہاتھ اُٹھاتی ہے کہ اللہ تعالےٰ انہیں ہمیشہ سلامت اور خوش و خرم رکھے!

سیّد انور حُسین شاہ نفیس رقم

قیام پاکستان کے بعد ایک طالب علم اورینٹل کالج میں داخل ہوئے، اور اُنہوں نے باقاعدگی سے اُردو زبان وادب کی تعلیم حاصل کرنی شروع کی۔ وہ عربی، فارسی جانتے تھے لیکن اب اُردو زبان وادب کا باقاعدہ مطالعہ کرنا چاہتے تھے۔ مجھ سے کئی دفعہ ملے، تو میں نے یہ اندازہ لگالیا کہ وہ اُردو ادب کے سنجیدہ طالب ہیں اور ادب کے مطالعے کا انہیں شوق ہے۔

یہ تھے سیّد انور حسین شاہ!

خوبصورت، خوش شکل، دراز قد، دُبلے پتلے، کتابی چہرہ، گندمی رنگ، داڑھی مونچھیں صاف، سر پر انگریزی بال، شیروانی اور شلوار میں ملبوس، وہ مجھے ایک جاذب نظر اور دِل آویز شخصیت کے مالک نظر آئے۔

یہ زمانہ اُن کی جوانی کا زمانہ تھا۔ اُس وقت اُن کی عمر بیس بائیس سال سے زیادہ نہیں تھی۔ لیکچروں میں باقاعدگی سے آتے تھے۔ طالب علموں سے زیادہ مِلتے جُلتے نہیں تھے۔ عام طور پر خاموش اور سنجیدہ رہتے تھے۔ اُستادوں کی عزّت کرتے تھے۔ شرم وحیا کا پیکر تھے۔ دوسرے طالب علموں کی طرح اُستادوں سے زیادہ مِلتے نہیں تھے۔ لیکچروں میں شریک ہوتے تھے، اور اس کے بعد گھر چلے جاتے تھے۔

میں اُن کے بارے میں کچھ نہیں جانتا تھا کہ وہ کون ہیں، کہاں رہتے ہیں، اور کیا کرتے ہیں؟ لیکن جب دسمبر میں امتحان ہوا، اور میں نے اُن کی امتحان کی کاپی دیکھی تو میں اُن کے خط کی خوبصورتی کو دیکھ کر حیران رہ گیا۔ اُن کی کاپی کو بار بار پڑھا، اور اُن کی خوش نویسی سے لُطف اندوز ہوا، اور میرے دل میں یہ معلوم کرنے کی خواہش پیدا ہوئی کہ خط میں یہ حُسن و جمال اُن کے پاس کہاں سے آیا ہے، اور یہ فن اُنہوں نے کس سے سیکھا ہے۔

چنانچہ میں نے ایک دن انہیں اپنے پاس بُلایا، اور اُن کی امتحان کی کاپی اُنہیں دکھا کر پوچھا "ایک عام طالب علم کا خط اتنا خوبصورت نہیں ہو سکتا۔ یہ فن آپ نے کس سے سیکھا ہے"؟

کہنے لگے "میرے خط میں کوئی خاص بات نہیں ہے۔ آپ کا حُسنِ ذوق اور حُسنِ نظر ہے۔ ویسے میں پیشے کے اعتبار سے خوش نویس ہوں۔ کتابت کرتا ہوں۔ میرے والد صاحب بھی خوش نویس ہیں، نسخ اور نستعلیق دونوں لکھتے ہیں۔ لیکن اب صرف کلام پاک کی کتابت کرتے ہیں۔ وہی میرے اُستاد ہیں۔ میں نے انہیں سے یہ سب کچھ سیکھا ہے"۔

میں نے کہا "اللہ تعالےٰ نے آپ کے ہاتھ میں تخلیقِ حُسن کی ایسی صلاحیتیں عطا فرمائی ہیں جو کم لوگوں کو نصیب ہوتی ہیں۔ میں آپ کے فن سے بہت مُتاثر ہوا ہوں"۔ یہ کہہ کر میں نے اُن کی کاپی اپنے پاس رکھ لی، بار بار اُس کو دیکھا۔ طالب علموں کو بھی یہ کاپی دکھائی اور اس طرح سارے کالج کو اس کا علم ہو گیا کہ ایک ماہرِ فن اُن کے کالج کا طالب علم ہے۔

چند سال سیّد انور حسین شاہ ہمارے ساتھ کالج میں رہے، اپنی تعلیم مکمل کی، اور لاہور میں باقاعدگی سے خوش نویسی کا کام کرنے لگے۔ اُن کی نشست کچھ عرصہ تک گنپت روڈ کے ایک پرانے مکان کی دوسری منزل پر رہی۔ اور کام بھی کرتے تھے۔ میں کئی بار اُن کی اس بیٹھک میں گیا، اور اس طرح شاہ صاحب

سے میرے تعلقات اُستادی اور شاگردی کی حُدود سے نکل کر دوستی کی سرحدوں میں داخل ہو گئے۔

یہاں لوگ انہیں گھیرے رہتے تھے، اور دور دور سے کتابت کروانے کے لئے اُن کے پاس آتے رہتے تھے۔ ان کو دیکھ کر مجھے یہ اندازہ ہوا کہ شاہ صاحب بہت مشہور آدمی ہیں، اور خوش نویسوں کے حلقے میں اُن کو نہایت عزت اور احترام کی نظروں سے دیکھا جاتا ہے۔ لاہور کے بڑے بڑے خوش نویس اُن کی فنی صلاحیتوں کے معترف اور معتقد ہیں۔ اور اُن کا نام لاہور کے صف اول کے خوش نویسوں، عبدالمجید پروین رقم، تاج الدین زرین رقم اور یوسف سدیدی کے نام کے ساتھ لیا جاتا ہے۔ دیکھتے دیکھتے خاصی تعداد میں اُن کے شاگرد بھی اس بیٹھک میں آنے لگے اور اُن سے استفادہ کرنے لگے۔ چند سال میں اپنے شاگردوں کی اچھی خاصی ایک کھیپ انہوں نے نکال دی۔ پنجاب کے دیہاتوں تک سے لوگ اُن کے پاس آنے لگے، اور قلیل عرصے میں شاہ صاحب نے انہیں اعلےٰ درجے کا خوش نویس بنا دیا۔

اس کے بعد نفیس رقم صاحب کچھ عرصے حضرت میاں میرؒ کی درگاہ کے قریب رہے، اور پھر جامعہ مدنیہ کریم پارک میں کئی سال تک انہوں نے بسیرا کیا۔ اب اِسی مدرسے کے سامنے انہوں نے اپنا نہایت سادہ سا مکان بنالیا ہے۔ اس مکان کے ایک کمرے میں انہوں نے اپنی لائبریری بھی بنالی ہے جس میں اپنے ذوق کی کتابیں نہایت سلیقے سے محفوظ کی ہیں۔ میری کتابوں کا مکمل سیٹ بھی اگر کہیں دستیاب ہو سکتا ہے، تو وہ شاہ صاحب کی لائبریری ہے۔ میری جو کتابیں میرے پاس بھی نہیں ہیں، وہ شاہ صاحب کے پاس موجود ہیں۔

اسی مکان کے پُرسکوں ماحول میں شاہ صاحب اپنے قلم سے حُسن و جمال کے دریا بہاتے ہیں اور یہیں اُن کے شاگردوں اور پرستاروں کا جمگھٹا رہتا ہے ؎

ہر کُجا چشمۂ بود شیریں
مردم و مُرغ و مور گِرد آیند

یہ غالباً ۵۵-۱۹۵۴ء کی بات ہے کہ مجھے میر تقی میر کے کلیات کو از سرِنو ترمیم واضافے کے ساتھ مع حواشی اور تعلیقات کے شائع کرنے کا خیال آیا۔ کلیاتِ میر ایک زمانے سے نایاب تھا۔ میں نے اُن کا خاصا کلام مختلف قلمی اور مطبوعہ نسخوں کو سامنے رکھ کر جمع کر لیا تھا۔ حواشی بھی تیار کر لئے تھے، مقدمہ بھی لکھ لیا تھا۔ ایک دن میں نے شاہ صاحب سے اس کی طباعت واشاعت کے بارے میں مشورہ کیا تو اُنھوں نے فوراً کہا "اس کی کتابت میں کروں گا۔ میرے لئے یہ سعادت ہوگی"۔

میں نے کہا "میری خواہش بھی یہی تھی، لیکن میں نے آج تک آپ سے صرف اس وجہ سے نہیں کہا کہ آپ اس کی کتابت کے لئے اتنا وقت کیسے نکال سکیں گے۔ بڑے سائز کے تقریباً دو ہزار صفحات کی کتاب ہوگی"۔

کہنے لگے "کوئی بات نہیں۔ میں اللہ کا نام لے کر شروع کر دیتا ہوں۔ پیش لفظ، مقدمہ اور چند دیوان میں لکھ دوں گا۔ بقیہ اپنے بعض ایسے شاگردوں سے لکھوا دوں گا جو میری روش کے مطابق کتابت کرتے ہیں"۔

میں اُن کی یہ بات سُن کر خوش ہوا، اور میں نے اپنا مرتب کیا ہوا کلیات میر کا مسودہ یہ کہہ کر اُن کے حوالے کر دیا کہ "سپردم بہ تو مایۂ خویش را"۔

شاہ صاحب نے بڑے ہی جذب وشوق سے اس کی کتابت کا کام شروع کر دیا، اور مقدمے کے علاوہ میر کے کئی دیوان لکھ ڈالے۔ کتابت اتنی خوبصورت تھی کہ اس کو دیکھ کر جی خوش ہو گیا۔ کلیات کے کچھ حصوں کی کتابت شاہ صاحب نے اپنے شاگردوں سے بھی کروائی۔ اس طرح کوئی ڈیڑھ دو سال میں اس کی کتابت کا کام مکمل ہو گیا۔ مصور مشرق عبدالرحمٰن چغتائی صاحب نے اس کا نہایت ہی خوبصورت گرد پوش کا ڈیزائن بنایا۔ کتاب چھپائی کے لئے پریس میں دے دی گئی، اور اوائل ۱۹۵۸ء میں چھپ کر بازار میں آ گئی۔ شاہ صاحب اس کو دیکھ کر خوش ہوئے۔ لوگوں نے اس کو ہاتھوں ہاتھ لیا، اور جلد ہی اس کا پہلا ایڈیشن نایاب ہو گیا۔ اس کی مقبولیت کی وجہ شاہ صاحب کا اہتمام کتابت تھا۔ افسوس ہے کہ پریس والوں کی بے پروائی کی وجہ سے اس کی کچھ

کاپیاں خراب ہوگئیں، اِن حصّوں کی کتابت ناشر نے از سرِ نو کروائی۔ اس میں کتابت کی کچھ غلطیاں رہ گئیں۔ لیکن مجموعی طور پر کتاب کے حُسن اور افادیت میں کوئی فرق نہیں آیا۔ بہرحال شاہ صاحب کی دلچسپی اور لگن کے باعث میر کا مطبوعہ اور غیر مطبوعہ کلام ایک ضخیم اور حسین کتاب کی صورت میں منظرِ عام پر آگیا۔

اس کے بعد سے آج تک تقریباً چالیس سال تک سید انور حسین شاہ میری کتابوں کی کتابت اور طباعت و اشاعت کے سلسلے میں مجھے مفید مشورے دیتے رہے، اور میری بیشتر کتابیں، جن کی تعداد اب تقریباً سَو کے قریب پہنچ گئی ہے شاہ صاحب کی مدد اور مشورے سے نہایت خوبصورت انداز میں شائع ہوتی رہیں۔ مُصورِ مشرق عبدالرحمٰن چغتائی صاحب مرتے دم تک اس کے گردپوش کے ڈیزائن بناتے رہے۔ اُن کی وفات کے بعد شاہ صاحب نے اِن کتابوں کے سرورق بنائے، اور آج تک بنا رہے ہیں۔ اِن میں سے ہر ایک خوش نویسی کا شاہکار ہے۔

سید انور حُسین شاہ ایک ایسے خاندان کے چشم و چراغ ہیں جو ہمیشہ سے دینِ اسلام کا علم بردار، عشقِ رسول صلی اللہ علیہ وسلّم سے سرشار اور صوفیائے کرام کا پرستار رہا ہے۔ اس ماحول میں آنکھ کھولنے اور پرورش پانے کی وجہ سے وہ ہمیشہ سے دینی روایات کی پابندی کے ساتھ زندگی بسر کرتے رہے، اور روز بہ روز اُن کے اس میلانِ طبع میں اضافہ ہوتا رہا۔ چنانچہ وہ عینِ عالمِ شباب میں حضرت مولانا شاہ عبدالقادر رائپوریؒ کے حلقۂ ارادت میں داخل ہوگئے، اُن سے بیعت کرلی، اور اُن سے یہ ارادت اس حد تک بڑھی کہ شاہ صاحب نے اُن کے وطن رائے پور ضلع سہارنپور میں جاکر مہینوں قیام کیا، اور اُن کے زیرِ سایہ طریقت کی مختلف منزلوں سے آشنا ہوئے۔ چند سال بعد جب رائے پوری صاحبؒ کا وصال ہوا تب بھی شاہ صاحب کی ارادت اُن کے ساتھ قائم رہی، اور اب بھی قائم ہے۔ حضرت رائے پوریؒ کی ذاتِ گرامی کے ساتھ جو قُرب انہیں حاصل رہا، اُس نے اُن کی دُنیا ہی بدل دی، اور اس کی بدولت وہ روحانیت کی ایسی منزلوں سے ہم کنار ہوئے جو کم لوگوں کو نصیب ہوتی ہیں۔ اس اعتبار سے وہ ایک خوش قسمت انسان ہیں۔

اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ سید انور حسین شاہ دُنیاوی اور مادی چیزوں سے بالکل بے نیاز ہو گئے۔ زیادہ وقت عبادت و ریاضت میں گذارنے لگے۔ داڑھی رکھ لی، آرائش و زیبائش سے پاک صاف سُتھرا لیکن سادہ لباس زیب تن کرنے لگے۔ دینی کتابوں کا مطالعہ بھی اُنھوں نے اس زمانے میں بڑے جذب و شوق سے کیا، اور اسلامی تصوف کے راز ہائے سربستہ سے بھی پوری طرح آشنا ہوئے۔ تصوف کی نادر و نایاب کتابوں کا مطالعہ بھی بڑی محنت سے کیا، اور فارسی اور اُردو میں صوفیانہ ادب و شعر کے مطالعے کو بھی اُنھوں نے اپنا وظیفہ بنالیا، اس مطالعے نے اُن کی دُنیا ہی بدل دی، اور وہ روحانیت اور پاکیزگی کی اس منزل پر پہنچ گئے جہاں تک رسائی اس دورِ پُر آشوب میں آسان نہیں ہوتی۔

شاہ صاحب اس زمانے میں جذب و جنوں کی دولت بیش بہا سے مالامال ہوئے۔ اس جذب و جنوں ہی کی بدولت انھیں کئی بار عمرہ کی سعادت نصیب ہوئی۔ کئی بار حج کے لئے بھی گئے۔ رمضان المبارک کے کئی مہینے اُنھوں نے دیارِ حبیب صلی اللہ علیہ وسلم میں گذارے۔ پاکستان اور ہندوستان کے اولیاء اللہ کے مزاروں پر بھی حاضری دی، اور کئی دفعہ خاصا وقت انھوں نے حیدرآباد دکن جاکر حضرت خواجہ بندہ نواز گیسو دراز کی درگاہ میں بھی گذارا اور جب بھی وہاں سے واپس آئے تو خواجہ صاحب علیہ الرحمۃ کی ایسی مطبوعہ اور غیر مطبوعہ تصانیف اپنے ساتھ لائے جو اب کسی قیمت پر دستیاب نہیں ہوتیں۔

یہ کتابیں شاہ صاحب نے مجھے دکھائیں تو میں اُن کو دیکھ کر حیران رہ گیا، اور میں نے شاہ صاحب کو یہ مشورہ دیا کہ وہ حضرت خواجہ بندہ نواز گیسو دراز کی سوانح حیات اور تصانیف پر ایک مبسوط کتاب لکھیں۔ انھوں نے اس کا وعدہ بھی کیا، لیکن اپنی دوسری مصروفیات کی وجہ سے وہ ابھی تک اس کام کی طرف پوری طرح توجہ نہ کر سکے۔ خدا کرے وہ اس کام کی تکمیل کی طرف جلد از جلد متوجہ ہو سکیں کیونکہ اس موضوع پر جتنا مواد اُنھوں نے جذب و شوق کے ساتھ جمع کیا ہے، اس کا جمع کرنا کسی اور کے بس کی بات نہیں۔

حضرت خواجہ بندہ نواز گیسو دراز سے شاہ صاحب کی دلچسپی کی ایک وجہ یہ بھی

ہے کہ خود اُن کا تعلق اسی خاندان سے ہے۔ شاہ صاحب نے مجھے بتایا کہ ”عرصہ ہوا خواجہ صاحب کے خاندان کے کچھ لوگ پنجاب آگئے اور ضلع سیالکوٹ میں آباد ہوئے۔ ہم لوگ انہیں کے خاندان سے تعلق رکھتے ہیں۔ خیال ہے کہ اس خاندان سے کچھ افراد تبلیغ دین اور مسلکِ تصوف کی ترویج و اشاعت کی غرض سے یہاں آئے۔ سید انور حسین شاہ کے خاندان کے لوگ انہیں کی اولاد ہیں، اور آج تک اس علاقے میں کسی نہ کسی طریقے سے تبلیغ دین اسلام اور تصوف و روحانیت کے فروغ کے لئے کام کر رہے ہیں۔

سید انور حسین شاہ کو میں نے اپنی آنکھوں سے اس کام میں مشغول و مصروف دیکھا ہے۔ اُنہوں نے اپنے فکر و عمل سے بے شمار انسانوں کو صحیح طور پر دین اسلام کا علمبردار اور راہِ تصوف کا مسافر بنایا ہے۔ اُن کی شخصیت میں جو سادگی اور نرمی، جو اخلاص اور محبت اور جو شرافت اور انسانیت ہے، اُس کی سحرکاری کا اثر یہ ہوتا ہے کہ جو شخص بھی اُن کے قریب آتا ہے، اُس کی دُنیا ہی بدل جاتی ہے، اور وہ شاہ صاحب کے دکھائے ہوئے راستے پر گامزن ہو جاتا ہے۔ شاہ صاحب عرصۂ دراز سے یہ کام کر رہے ہیں، اور اپنے اس کام میں پوری طرح کامیاب ہیں۔

سید انور حسین شاہ صاحب کی وضع داری کا یہ عالم ہے کہ آج سے تقریباً چالیس پینتالیس سال قبل میرے اور اُن کے درمیان اُستادی شاگردی کا جو رشتہ قائم ہوا تھا، وہ اس کو آج تک نباہ رہے ہیں۔ میرے پاس ابھی تک اسی طرح آتے ہیں جس طرح برسوں قبل آتے تھے۔ گھنٹوں میرے پاس بیٹھتے ہیں، اور نظریں نیچی کر کے ابھی تک مختلف موضوعات پر باتیں کرتے ہیں۔ کبھی آنکھ ملا کر باتیں نہیں کرتے۔ میرے اصرار پر میرے ساتھ کھانا کھاتے ہیں، چائے پیتے ہیں لیکن تکلّف بہت کرتے ہیں۔ مجھے ہمیشہ یہ احساس ہوتا ہے کہ کھانے اور چائے کے ساتھ انصاف نہیں کر رہے ہیں۔

ایک دن بڑا دلچسپ واقعہ پیش آیا۔ شاہ صاحب آئے تو میں نے ایک ایسے

چائے کے سیٹ میں اُن کو چائے پیش کی جو کسی چینی مصوّر کی نہایت خوبصورت تصویروں سے مُزیّن تھا۔ یہ جاذب نظر تصویریں خوبصورت عورتوں کی تھیں۔ یہ سیٹ میں نے چند روز قبل ہی خریدا تھا۔ اِن برتنوں میں چائے آئی تو شاہ صاحب خاصی دیر تک چپ چاپ بیٹھے رہے۔ چائے کی پیالی کو ہاتھ نہیں لگایا۔

میں نے پوچھا "شاہ صاحب کیا بات ہے؟ آپ چائے کیوں نہیں پی رہے ہیں"۔

نظریں نیچی کر کے بولے "میرے لئے دوسری پیالی منگوا دیجئے۔ میں سادہ سی پیالی میں چائے پیوں گا۔ اس پیالی پر عورتوں کی تصویریں ہیں۔ میں اس میں چائے کیسے پیوں؟

مجھے اُن کی اس بات پر بے اختیار ہنسی آگئی۔ لیکن میں نے ہنسی کو ضبط کرتے ہوئے کہا "یہ تصویریں ایک مشہور چینی مُصوّر کی ہیں جو اِن برتنوں پر بنائی گئی ہیں۔ یہ مُصوری کا شاہکار ہیں، اور نہایت دلکش اور جاذب نظر ہیں"۔

لیکن شاہ صاحب چُپ رہے۔ کچھ نہیں بولے۔

میں نے اُن کی پریشانی کو محسوس کیا، اور دوسرے برتنوں میں چائے بنا کر اُنہیں پیش کی بہت خوش ہوئے اور انھوں نے بغیر تصویر کے سادہ سی پیالی میں بڑے شوق سے چائے پی۔

پھر دبی زبان سے کہا "اُس پیالی پر عورت کی تصویر تھی۔ میری ہمت نہیں پڑی کہ اس پیالی کو منہ لگاؤں اور اُس میں چائے پیوں"۔

مجھے اُن کی اِس بات پر پھر ہنسی آگئی لیکن میں نے اپنی ہنسی کو ضبط کرتے ہوئے کہا "تصویریں تو تصویریں ہیں۔ بے جان چیزیں ہیں۔ ان سے دلچسپی لینا یا محظوظ ہونا گُناہ نہیں ہے۔ اور پھر اب تصویریں تو ہواؤں میں ہیں، فضاؤں میں ہیں، ٹیلی وژن کی وجہ سے گھروں میں ہیں۔ انسان کہاں تک اِن سے پیچھا چھڑائے گا۔ شاید اسی لئے عُلماء نے تصویریں دیکھنے اور بنانے کے لئے فتوے دے دئیے ہیں"۔

غرض دیر تک میں اس موضوع پر اپنے خیالات کا اظہار کرتا رہا، اور شاہ صاحب چُپ چاپ میری یہ باتیں سنتے رہے۔ کچھ نہیں بولے، لیکن اُن کے انداز سے

میں نے یہ محسوس کیا کہ وہ اپنے مؤقف پر قائم ہیں۔

سیّد انور حسین شاہ صاحب نہایت نیک اور شریف انسان ہیں کم آمیز ہیں۔ بہت کم لوگوں سے ملتے ہیں۔ اپنے کام میں مصروف رہتے ہیں۔ اپنے قلم سے گل و گلزار سے کھلاتے ہیں۔ رعنائی اور بانکپن کے جو پہلو میں نے اُن کے خط میں دیکھے ہیں، وہ مجھے کہیں اور نظر نہیں آئے۔ میرے ساتھ انہیں جو محبت اور عقیدت ہے اس کی وجہ سے میری تقریباً تمام کتابوں کے سرورق اُنہوں نے لکھے ہیں، اور اپنے قلم سے اُن کو ایسا حسین بنا دیا ہے کہ جی چاہتا ہے بس اُن کو دیکھتے رہیئے۔ مادی چیزوں سے اُنہیں کوئی دلچسپی نہیں ہے۔ ہوس زر اُن میں نام کو نہیں ہے۔ وہ نہایت سادہ زندگی بسر کرتے ہیں اُنہوں نے اپنی ضروریات کو اس حد تک محدود کر لیا ہے، جیسے اُنہیں کسی چیز کی ضرورت ہی نہیں۔ وہ متوازن اور معتدل قسم کے دین دار آدمی ہیں، اور عشق رسولؐ سے سرشار ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے اُسوۂ حسنہ کی جھلکیاں اُن کے قول و فعل میں اپنا جلوہ دکھاتی ہیں۔

میں جب بھی شاہ صاحب سے ملتا ہوں، جب بھی اُن کے ہاں جاتا ہوں یا جب بھی وہ میرے ہاں آتے ہیں تو اُن سے مل کر اور باتیں کر کے مجھے یوں محسوس ہوتا ہے جیسے دور دور تک چاندنی سی کھلی ہوئی ہے، اور حُسن و جمال کی بادِ نو بہار، اپنی تمام تر رنگینیوں اور رعنائیوں کے ساتھ میری نظروں کے سامنے محوِ خرام ناز ہے۔

ڈاکٹر عُبید اللہ خاں

ڈاکٹر عُبید اللہ خاں میرے عزیز شاگرد ہیں۔ آج سے تقریباً چالیس سال قبل وہ اورینٹل کالج میں ام۔اے اُردو کے طالب علم کی حیثیت سے داخل ہوئے۔ کئی سال تک وہ میرے ساتھ رہے۔ اُردو میں ام۔اے کرنے کے بعد اُنہوں نے عربی میں بھی ام۔اے کیا، اور پھر اُردو میں پی ایچ ڈی کے لئے کئی سال تک پریم چند پر کام کرتے رہے۔ بالآخر اُنہوں نے پی ایچ ڈی کی ڈگری لی، اور پھر اسلامیہ کالج چینوٹ میں اُردو کے اُستاد اور پرنسپل ہوگئے۔ تقریباً بیس سال اُنہوں نے اس کالج میں کام کیا۔ پھر ایچی سن کالج میں آگئے لیکن وہاں سال بھر سے زیادہ نہیں رہے۔ کیونکہ اورینٹل کالج کے شعبۂ اُردو میں اُستاد کی حیثیت سے اُن کا تقرر ہوگیا۔ چنانچہ اُنہوں نے کئی سال تک میرے ساتھ ایک اچھے رفیق کار کی حیثیت سے کام کیا، اور شعبۂ اُردو اور اورینٹل کالج کے مختلف انتظامی معاملات میں میرا ہاتھ بٹایا۔

قیام پاکستان کے بعد اورینٹل کالج میں جب شعبۂ اُردو قائم ہوا تو داخلوں پر کوئی پابندی نہیں تھی۔ ہر شخص، جس نے بی۔اے پاس کیا ہو وہ ام۔اے میں داخل ہوسکتا تھا۔ عمر کی بھی کوئی قید نہیں تھی۔ چنانچہ اس زمانے میں مجھے کئی ایسے شاگرد ملے جو عمر میں تقریباً میرے برابر ہی تھے۔ اِن میں ملک بشیر الرحمٰن مرحوم، قیوم نظر، سیّد امجد الطاف،

۱۔ دنسیم، مرزا منور، شہرت بخاری، فشکور حسین یاد، غلام حسین، مجید یزدانی، ڈاکٹر سید ناظر حسن زیدی اور ڈاکٹر عبید اللہ خاں خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔ یہ لوگ پختہ عمر کو پہنچ چکے تھے، ملازمتیں بھی کرتے تھے اور اورینٹل کالج میں پڑھتے بھی تھے۔

ڈاکٹر عبید اللہ خاں جب اورینٹل کالج میں آئے تو اس سے قبل مشرقی اور دینی علوم کی تعلیم کے مختلف مراحل طے کر چکے تھے۔ وہ درسِ نظامی کے فاضل تھے حافظ قرآن تھے۔ اور عربی، فارسی اور دینی علوم پر اُن کی گہری نظر تھی۔ مشہور عالم دین اور سیاست داں مُفتی محمود مرحوم اُن کے کلاس فیلو تھے، اور خاں صاحب اُن کا ذکر بڑے فخر کے ساتھ کرتے تھے۔

طالب علمی کے زمانے میں ایک دن خاں صاحب نے مجھ سے کہا "میں مفتی محمود صاحب کا کلاس فیلو ہوں، اور سیاست میں ترقی پسندانہ زاویہ نظر رکھتا ہوں"۔

میں نے کہا "خاں صاحب! یہ تو اچھی بات ہے، لیکن زبان بند رکھیئے۔ ترقی پسندوں پر یہاں پابندی ہے"۔

خاں صاحب کا چہرہ سُرخ ہو گیا۔ کسی قدر غصّے میں آ گئے۔ کہنے لگے "میں کسی کی پروا نہیں کرتا۔ میرے خیالات یہی ہیں میرا کوئی کیا بگاڑے گا"۔

اس کے علاوہ بھی اُنہوں نے نہ جانے کیا کیا کچھ کہا۔ میں اُن کی یہ باتیں سُنتا رہا، اور جب ذرا وہ ٹھنڈے ہوئے تو میں نے کہا "آپ واقعی پٹھان ہیں"۔

کہنے لگے "میں اپنے پٹھان ہونے پر فخر کرتا ہوں۔ کسی سے ڈرتا نہیں۔ کسی کی لگی لپٹی نہیں رکھتا۔ میں حکومت کا ملازم ضرور ہوں۔ اورینٹل کالج کا طالب علم بھی ہوں۔ لیکن میں سیاسی آدمی ہوں، اور سیاست میں ترقی پسند نظریے کا قائل ہوں۔ مُفتی صاحب سے متاثر ہوں۔ کھرا آدمی ہوں۔ کھری بات کرتا ہوں"۔

میں نے کہا "یہ تو اچھی بات ہے۔ میرے دل میں آپ کی بڑی عزت ہے۔ لیکن یہاں شر بہت ہے اس لئے احتیاط ضروری ہے"۔

لیکن وہ تو خاں صاحب تھے۔ احتیاط کا لفظ اُن کی لغت میں نہیں تھا۔ وہ ہمیشہ سیاسی

معاملات میں شمشیر برہنہ رہے۔ کبھی کسی کی پروا نہیں کی، کبھی کسی سے ڈرے نہیں۔ کبھی منافقت اور مصلحت سے کام نہیں لیا۔ جو صحیح سمجھتے تھے اُس کا اظہار کرتے رہے۔

آج بھی اُن کا یہی حال ہے اور وہ اسی راستے پر گامزن ہیں۔

وہ اپنے اُستادوں کی بڑی عزّت کرتے تھے، اور آج تک کرتے ہیں۔ حالانکہ ایک زمانے سے وہ خود ایک اُستاد ہیں۔ میں نے ایسے وضع دار اور اُستادوں کی عزت کرنے والے شاگرد کم ہی دیکھے ہیں۔ میری اور خاں صاحب کی عُمر میں ایسا کچھ زیادہ فرق نہیں ہے۔ لیکن اُستاد کی عزّت جس طرح کرنی چاہیئے، آج بھی وہ اسی طرح عزّت کرتے ہیں۔ مثلاً کبھی آنکھ مِلا کر بات نہیں کرتے۔ کبھی ہاتھ نہیں ملاتے۔ کبھی برابر میں نہیں بیٹھتے۔ کبھی بے تکلّف نہیں ہوتے۔ کبھی نام نہیں لیتے۔ زیادہ باتیں نہیں کرتے۔ صرف عید اور بقرعید کے دن میرے پاس آتے ہیں تو معانقہ کرتے ہیں اور ہاتھ بھی مِلاتے ہیں۔

اورینٹل کالج میں تقریباً بیس پچیس سال وہ میرے ساتھ اُستاد رہے لیکن اُن کے اس روّیے میں کبھی کوئی فرق نہیں آیا۔

ڈاکٹر عُبیداللہ خاں بڑے مخلص اور مُستعد آدمی ہیں۔ اورینٹل کالج کے دورانِ قیام میں اُنھوں نے انتظامی کاموں میں میرا ہاتھ بٹایا، اور صدر شعبہ اور پرنسپل کے لئے جو مسائل پیدا ہوئے اُن کو انھوں نے بڑی بصیرت اور مُستعدی سے سُلجھانے کی کوشش کی، اور ایمان کی بات یہ ہے کہ انھوں نے میرے بوجھ کو ہمیشہ ہلکا کیا۔ وہ کالج کی دیکھ بھال بڑے سلیقے سے کرتے تھے۔ وارڈن کی حیثیت سے ہوسٹل کے نظام کو بھی اچھی طرح چلاتے تھے۔ طالب علموں کے مسائل کو بھی بالا ہی بالا حل کر دیتے تھے۔ یہ زمانہ سیاسی انتشار کا زمانہ تھا۔ طالب علم سیاسی جماعتوں کے آلۂ کار بن گئے تھے۔ اسٹاف میں کچھ نادان قسم کے لوگ بھی آگئے تھے جن کے مزاج میں شر بہت تھی۔ خاں صاحب نے ان سب کو اپنے قابو میں رکھا، اور اُن کی وجہ سے کالج کا نظام بڑی خوش اسلوبی سے چلتا رہا۔

طالب علموں کے ساتھ اُن کا گہرا رابطہ تھا۔ لڑکے لڑکیاں اُن کی عزّت کرتے تھے

کیونکہ وہ ایک نہایت شفیق اُستاد تھے۔ کسی طالب علم کو جب بھی کوئی مسئلہ پیش آتا تو خاں صاحب ذاتی طور پر دلچسپی لے کر اُس کو سُلجھا دیتے تھے۔ ہر طالب علم کا ریکارڈ اُن کے سینے میں محفوظ رہتا تھا۔ وہ ہر طالب کو نہ صرف جانتے اور پہچانتے تھے بلکہ انہیں یہ بھی معلوم تھا کہ وہ کہاں رہتا ہے، کیا کرتا ہے، کس قسم کی صحبتوں میں وقت گذارتا ہے؟ وہ لڑکیوں پر خاص طور پر نظر رکھتے تھے۔ خاں صاحب نے لڑکیوں کو مشرقی اور اسلامی آداب سکھائے، اور کسی کو کبھی پٹڑی سے اُترنے نہیں دیا۔ کوئی لڑکی اُن کے سامنے سے بغیر دوپٹہ سر پر اوڑھے ہوئے گذر نہیں سکتی تھی۔ کبھی پیار محبت سے اُن کو سمجھاتے تھے اور کبھی ڈانٹ ڈپٹ کر کے اُن کو اعلےٰ اخلاقی اقدار کا درس دیتے تھے۔

خاں صاحب سیاست میں ترقی پسند اور روشن خیال تھے لیکن تہذیبی اور معاشرتی معاملات میں حد درجہ قدامت پسند تھے۔ اگر کوئی طالب علم، خصوصاً لڑکی، مروجہ تہذیبی اور معاشرتی اقدار سے انحراف کرتی تھی تو خاں صاحب کو غصہ آجاتا تھا، اور اس کو وہ سزا دینے سے بھی گریز نہیں کرتے تھے۔ ایسے ہی مقامات پر میرا اُن سے اختلاف ہوتا تھا۔ کیونکہ میں طالب علموں کے معاملات میں جرم و سزا کے نظام کا قائل نہیں تھا۔ میں تو صوفیائے کرام کے نقشِ قدم پر چلتا تھا، اور عفو و درگذر سے کام لیتا تھا میں نے سیکڑوں ہزاروں طالب علموں کو اس حکمت عملی کی وجہ سے شیشے میں اُتارا، اور اُن کی دُنیا ہی بدل دی۔ خاں صاحب میرے ساتھ اس حد تک جانے کے لئے تیار نہیں ہوتے تھے، اور ایسے ہی مواقع پر میرا اُن سے اختلاف ہوتا تھا۔ لیکن بالآخر وہ میری بات مان لیتے تھے، اور میرے ہمنوا ہو جاتے تھے۔

ایک دن ایک لڑکی اُن کے لکچر میں بل باٹم پہن کر آگئی۔ خاں صاحب نے اس کو کلاس سے باہر نکال دیا۔ وہ روتی ہوئی میرے پاس آئی، اور یہ سارا قصہ سُنایا۔ میں نے اُس کو بٹھایا، تسلّی دی، اور کہا کہ مَیں خاں صاحب کو سمجھا دوں گا۔ بل باٹم پہننے کا تو آج کل فیشن ہے۔ اس میں کوئی حرج نہیں ہے۔ خاں صاحب سے مُلاقات ہوئی تو میں نے انہیں توجہ دلائی، اور بدلتے ہوئے معاشرتی اور اخلاقی حالات کی روشنی میں اُن کے سامنے

نوجوان نسل کا تجزیہ کیا، تو انہوں نے مجھ سے اتفاق کیا، اور میری بات مان لی۔ اُس لڑکی کے سر پر ہاتھ رکھا، اور اس کو دیر تک سمجھاتے رہے۔ وہ اُن کی شفقت اور محبت سے کبھی محروم نہیں ہوئی۔

خاں صاحب طالب علموں کو شیر کی آنکھ سے دیکھتے لیکن سونے کا نوالہ کھلاتے تھے، اور اُن کا یہ رویہ طالب علموں کی کردار سازی میں بڑا مفید ثابت ہوتا تھا۔ انہوں نے اپنے اس رویے سے طالب علموں کو صحیح معنوں میں انسان بنایا۔ اُن کی شخصیتوں میں انسانی اقدار کی شمعیں فروزاں کیں۔ انہیں دین دار بنایا، اور اخلاقی اعتبار سے انہیں انتہائی بلندیوں پر پہنچا دیا۔ اُن کے زمانے میں اورینٹل کالج کے بیشتر طالب علم اپنی انہیں خصوصیات سے پہچانے جاتے تھے۔

اورینٹل کالج کے دورانِ قیام میں ڈاکٹر عبیداللہ خاں نے اساتذہ کے معاملات و مسائل میں بھی گہری دلچسپی لی۔ وہ پنجاب یونیورسٹی اکیڈمک اسٹاف ایسوسی ایشن کے سرگرم کارکن رہے اور برسوں تک اس کے نائب صدر اور صدر رہے۔ اُنہوں نے اپنی دلچسپی سے ایسوسی ایشن کو ایک فعال جماعت بنایا جس کے نتیجے میں یونیورسٹی کے اساتذہ کے بے شمار انفرادی اور اجتماعی مسائل حل ہوئے۔ رجعت پسند قوتوں کو انہوں نے اپنی کوششوں سے پامال کیا اور اساتذہ کو روشن خیالی اور ترقی پسندی سے ہم کنار کیا۔ میرے خیال میں یہ اُن کا سب سے اہم کارنامہ ہے۔ اساتذہ اُن کی عزت اس لئے کرتے، اور اُن کی بات مانتے تھے کہ وہ حافظ قرآن، دینی علوم کے ماہر، صوم و صلوٰۃ کے پابند ہونے کے باوجود ترقی پسند اور روشن خیال تھے۔ یونیورسٹی کے اساتذہ کے مسائل کو حل کرنا اُن کا نصب العین تھا، اور وہ اس کام کے لئے ہمیشہ کمربستہ رہتے تھے۔

اساتذہ کے مسائل کو حل کرنے کے ساتھ ساتھ وہ سال میں کئی بار اُن کے لئے ڈنر کا اہتمام بھی کرتے تھے۔ اپنی نگرانی میں قسم قسم کے کھانے پکواتے تھے، اور بڑے سلیقے سے اساتذہ کی تواضع کرتے تھے۔ عبیداللہ خاں کو کھانا کھانے اور کھانا پکوانے کا شوق تھا۔ اسٹاف ایسوسی ایشن کے ڈنر کے موقع پر تو کھانے کا اہتمام کرتے ہی تھے۔ لیکن جاننے

والوں کے ہاں جب کبھی شادیاں ہوتی تھیں تو انواع و اقسام کے کھانے پکوانے کا کام وہ اپنے ذمے لے لیتے تھے۔ اپنی نگرانی میں کھانے پکواتے تھے، اور دیگوں میں سے خود نکال نکال کر میزوں پر بھجواتے تھے۔ جو میرے خیال میں خاصا مشکل کام تھا۔ خلوص اور جذب و شوق کی وجہ سے یہ سب کچھ ڈاکٹر عُبید اللہ خاں ہی کر سکتے تھے۔

کھانوں کے بارے میں اُن کی معلومات حیرت انگیز تھی، اور وہ برعظیم کے مسلمانوں کے کھانوں کا ذکر بڑے جذب و شوق سے کرتے تھے، کھانے کے ہمیشہ سے شوقین تھے، اور اچھے اور خوش ذائقہ کھانوں کے ذکر میں بھی انہیں لذّت محسوس ہوتی تھی۔ مزے لے لے کر اِن چیزوں کا ذکر کرتے تھے، اور کھانے کی داد بھی خوب دیتے تھے۔

۱۹۷۳ء میں اورینٹل کالج کے جشن صد سالہ کے موقع پر بے شمار مہمان مندوب کی حیثیت سے لاہور آئے تھے۔ اُن کے کھانے کا انتظام ہم نے یونیورسٹی کیفیٹیریا کے مالک ڈین کے سُپرد کر دیا تھا۔ اُنہوں نے بڑی خوش اسلوبی سے ایک ہفتے تک مہمانوں کے کھانے کا انتظام کیا۔ نگرانی ڈاکٹر عبید اللہ خاں کے سُپرد کی تھی۔ اُنہوں نے اس کام میں اتنی دلچسپی لی کہ خود جا کر یہ دیکھتے تھے کہ کھانا کس طرح پک رہا ہے اور کس طرح مہمانوں کو پیش کیا جا رہا ہے۔ مینو بھی وہ خود بناتے تھے، اور یہ سب کچھ خان صاحب کی کھانوں کے معاملات سے دلچسپی تھی جس کی وجہ سے یہ کاروبار خوش اسلوبی کے ساتھ چلا اور کسی کو کبھی کوئی شکایت نہیں ہوئی۔ اس کامیابی کا سہرا خاں صاحب کے سَر رہا۔

خاں صاحب مندوبین کے کھانے میں لڑکوں لڑکیوں کو شریک نہیں ہونے دیتے تھے۔ لیکن میرا خیال یہ تھا کہ اُن کو شریک ہونا چاہیئے۔ کیونکہ وہ دن بھر ہمارے ساتھ کانفرنس کا کام کرتے تھے۔ اس لئے میں انہیں اپنے ساتھ کھانے کے پنڈال میں لے جاتا تھا۔ خاں صاحب اس پر جِز بِز ہوتے لیکن اپنے اُستاد اور پرنسپل کے سامنے کیا بولتے، چُپ ہو جاتے تھے۔

مجھے اس "دخل در معقولات" میں مزہ آتا تھا۔

خاں صاحب کے مزاج میں باقاعدگی بہت تھی۔ صبح کو کالج آجاتے تھے اور دن بھر کالج میں رہتے تھے۔ وقت پر لیکچر روم میں جاتے تھے، اور پورا ایک گھنٹہ لیکچر دیتے تھے۔ لیکچر کی تیاری اچھی طرح کرتے تھے، اور مختلف کتابوں اور رسالوں کے حوالے دے کر طالب علموں کے علم میں اضافہ کرتے تھے۔ لیکچر سے فارغ ہو کر وہ اپنے کمرے میں بیٹھتے تھے جہاں طالب علموں کا جمگھٹا رہتا تھا۔ وہ تمام طالب علموں کے مسائل کو سنتے اور اُن کی رہنمائی کرتے تھے۔ صبح سے شام تک اُن کا وقت کالج میں اسی طرح گذرتا تھا۔ لڑکے لڑکیاں اپنے ذاتی مسائل تک میں اُن سے مشورہ کرتے تھے، اور وہ ان معاملات میں بھی ہمیشہ اُن کی مدد کرتے تھے۔ شاگردوں کے بارے میں اُن کی معلومات کا یہ عالم تھا کہ اُن کے رول نمبر تک انہیں اَزبر تھے۔ انہیں یہ بھی معلوم تھا کون لڑکا کہاں رہتا ہے، کن لوگوں کے ساتھ اُٹھتا بیٹھتا ہے۔ کن لوگوں کی صحبتوں میں وقت گذارتا ہے۔ لڑکیوں کے گھروں کے پتے تک اُنہیں یاد تھے۔ اُن کے والدین کے بارے میں بھی انہیں خاصی معلومات تھی، اور وہ یہ بھی جانتے تھے کہ اُن کی مصروفیات کیا ہیں۔ کسی کو غلط یا نامناسب جگہ پر دیکھا تو دوسرے دن اُس کی شامت ہی آ گئی۔ ایسا جھاڑتے تھے کہ اُس کو بس دن میں تارے نظر آنے لگتے تھے۔

اُن کا مزاج مشرقی تھا لیکن وہ مغربی لباس کے دلدادہ تھے۔ ہمیشہ عمدہ قسم کا سوٹ پہنتے تھے۔ ٹائی لگاتے تھے، اور کلاس میں اس طرح جاتے تھے جیسے کسی تقریب میں شرکت کے لئے جا رہے ہیں۔ گرمیوں میں لیکچر کے دوران پسینہ بہتا رہتا تھا لیکن وہ نہ تو کبھی کوٹ اُتارتے تھے اور نہ ٹائی ڈھیلی کرتے تھے۔ کہتے تھے کہ اُستاد کو اُستاد نظر آنا چاہیئے، اور اس کے لئے ضروری ہے کہ وہ یا تو پورا سوٹ پہن کر کلاس میں جائے یا پھر شیروانی پہنے جو ہمارا قومی لباس ہے۔ اُن کی یہ ادا مجھے بہت پسند تھی۔

ڈاکٹر عُبید اللہ خاں دوستوں کے دوست اور دشمنوں کے دشمن تھے۔ کسی کو بخشتے نہیں تھے۔ میرے اس نظریے سے انہیں اختلاف تھا کہ دشمنوں کے ساتھ بھی اچھا سلوک

کرنا چاہیئے۔ میں تو عفو و درگذر کا قائل تھا لیکن خاں صاحب عفو و درگذر کے قائل نہیں تھے۔ کہتے تھے کہ جو شخص غلط بات کرے اس کو تحت الثریٰ میں پہنچا دینا چاہیئے۔ اُن کی محبت اور نفرت، دوستی اور دشمنی دونوں میں شِدت تھی۔ یقیناً یہ پٹھانوں کے خون کا اثر تھا۔

ڈاکٹر عبید اللہ خاں عالم آدمی ہیں۔ عربی، فارسی اور اُردو کے ادبیات پر اُن کی نظر بڑی گہری ہے۔ لیکن وہ لکھتے نہیں۔ اس لئے کہ اُن کا علم صرف اُن کے طالب علموں کے لئے ہے۔ جب میں انہیں تصنیف و تالیف کی طرف توجہ دلاتا ہوں تو وہ ہمیشہ کہتے ہیں کہ "میرا وقت طالب علموں کے لئے ہے۔ اُن کو پڑھاتا ہوں۔ ان کے کردار کی تعمیر کرتا ہوں، اُن کے مسائل کو سُلجھاتا ہوں، لکھنے کے لئے وقت کہاں سے لاؤں"۔

دراصل بات یہ ہے کہ وہ اُستادوں کے اُس قبیلے سے تعلق رکھتے ہیں جو صرف تدریس اور طالب علموں کی کردار سازی کو اہمیت دیتے ہیں۔ اس لئے تصنیف و تالیف اُن کے ثانوی حیثیت اختیار کر لیتی ہے۔

پھر بھی جو مضامین و مقالات انہوں نے لکھے ہیں، وہ اپنی جگہ اہم ہیں، اور اُن کو دیکھ کر یہ اندازہ ہوتا ہے کہ اُن کا علم بہت وسیع ہے، اور وہ ادبی موضوعات پر ترقی پسندانہ زاویۂ نظر سے خیال انگیز باتیں کرتے ہیں۔

وہ میرے عزیز شاگرد تھے اور میں انہیں اپنا دوست بھی سمجھتا تھا۔ لیکن خاں صاحب اُستادوں سے دوستی کرنے کے قائل نہیں تھے۔ دوستی اُن کے خیال میں بے تکلفی کو پیدا کرتی ہے، اور اس بے تکلفی سے استاد کا احترام مجروح ہوتا ہے۔ شاگرد کو تو اُن کے خیال میں دوست ہونے کے بجائے اُستاد کا خدمت گذار ہونا چاہیئے، اور وقت پڑنے پر اس کے لئے اپنی جان تک قربان کر دینی چاہیئے۔

اس کا عملی تجربہ مجھے اُس وقت ہوا جب میں ۸۱ - ۱۹۸۰ کے تعلیمی سال میں اکتیس سال کی ملازمت پوری کر کے اورینٹل کالج سے ریٹائر ہوا۔ یونیورسٹی نے بعض شر پسندوں کے ایما پر پنشن وغیرہ کے معاملات طے کرنے میں خواہ مخواہ تاخیر کی تو خاں صاحب کئی بار میرے

پاس آئے۔ حد درجہ جذباتی انداز میں یونیورسٹی کے ارباب اختیار کی مذمّت کی، وائس چانسلر پر برسے اور مجھ سے کہا کہ "مجھے خِدمت کا موقع دیجئے۔ میں اپنی بیوی کا زیور بیچ دوں گا لیکن آپ کو تکلیف نہیں ہونے دوں گا۔ مجھے اس کی اجازت دیجئے۔ خدمت سے مجھے محروم نہ رکھئے"۔

میں نے کہا خاں صاحب! آپ کا جذبہ قابل قدر ہے۔ لیکن ابھی یہ نوبت نہیں آئی ہے۔ مجھے تکلیف صرف اس لئے ہے کہ آج کل میرا مکان تعمیر ہو رہا ہے اور اس کے لئے مجھے کثیر رقم کی ضرورت ہے ورنہ تو گذر بسر ہو ہی جاتی۔ درویشی اور قلندری میرے کاروبار حیات کو چلا رہی ہے۔ انشاءاللہ حالات جلد معمول پر آجائیں گے۔ آپ فکر نہ کیجئے"۔

خاں صاحب میری یہ باتیں سُن کر چُپ ہو جاتے، خاموشی کی زبان میں نہ جانے کیا کیا کچھ کہتے، اور مجھے اُن کے اس انداز میں جذب و شوق اور خلوص و محبت کا ایک سمندر موج زن نظر آتا۔

آج بھی وہ میرے پاس اسی انداز میں آتے ہیں، اور میں اُن کے اس انداز سے جی بھر کے لُطف اندوز ہوتا ہوں!

ڈاکٹر سیّد ناظر حسن زیدی

قیام پاکستان کے بعد اورینٹل کالج میں جب نیا نیا شعبۂ اُردو کھُلا، اور اُردو زبان وادب سے دلچسپی رکھنے والے ہر شخص کو ام۔ اے اُردو میں داخلے کی اجازت ملی تو اُن میں ایک صاحب ڈاکٹر ناظر حسن زیدی بھی تھے۔ وہ ڈاکٹر عبید اللہ خاں کے ہم وطن اور کلاس فیلو بھی رہ چکے تھے۔ اب اِن دونوں نے ام۔ اے اُردو میں داخلہ لے لیا۔ دونوں میں دوستی اور بے تکلفی تھی، دونوں ایک دوسرے کا بہت خیال رکھتے تھے، اور ان دونوں کا زیادہ وقت ایک دوسرے کے ساتھ گذرتا تھا۔ دونوں ملازمت بھی کرتے تھے اور ام۔ اے اُردو میں پڑھتے بھی تھے۔ میری اور اُن کی عمروں میں ایسا کچھ زیادہ فرق نہیں تھا۔ لیکن اتفاق کی بات ہے کہ میں اُستاد تھا، اور وہ میرے شاگرد!

ناظر صاحب نہایت وضع دار آدمی تھے۔ وہ اپنے مخصوص انداز اور وضع قطع سے پہچانے جاتے تھے۔ دراز قد، کتابی چہرہ، اس پر چھوٹی سی خشخاشی داڑھی، گندمی رنگ، سر پر سیاہ مخمل کی ٹوپی، تنگ پاجامے اور لمبی شیروانی میں ملبوس، وہ ہمیشہ اسی وضع قطع سے نظر آتے تھے۔ آج بھی اُن کا یہ انداز بدلا نہیں ہے۔ تیس چالیس سال میں دُنیا بدل گئی۔ زندگی کے ہر شعبے میں انقلاب آ گیا لیکن ناظر صاحب میں کوئی تبدیلی رُونما نہیں ہوئی۔

وہ اُستادوں کے ساتھ بڑے ہی ادب اور احترام سے پیش آتے تھے۔ بالکل چھوٹی

عمر کے بچوں کی طرح اُن کے سامنے بیٹھتے تھے۔ بزرگ اساتذہ کی تو خیر بات ہی اور ہے، میرے سامنے تک وہ اسی طرح ہاتھ باندھ کر بیٹھتے تھے۔ حالانکہ وہ عمر میں مجھ سے کچھ بڑے تھے۔ میرے کمرے میں آتے تھے لیکن زیادہ باتیں نہیں کرتے تھے۔ کام کی بات کرتے تھے اور چلے جاتے تھے۔ کبھی ہاتھ نہیں ملاتے تھے۔ کبھی معانقہ نہیں کرتے تھے۔ بڑے مخلص اور جاں نثار آدمی تھے۔ اُستاد اور شاگرد کے مقدس رشتے کو سمجھتے تھے اس لئے درمیان میں فاصلہ رکھتے تھے تاکہ اُستاد اور شاگرد کے نازک رشتے کا تقدس مجروح نہ ہو۔ میں نے ایسے وضع دار، با اخلاق، مخلص اور مہذب شاگرد اپنی چالیس پینتالیس سال کی تعلیمی زندگی میں کم ہی دیکھے ہیں۔

اورینٹل کالج سے ناظر صاحب نے پہلے اُردو میں ام۔ اے کیا۔ اُس کے بعد ام۔ اے فارسی میں داخل ہو گئے، اور فارسی میں بھی اُنہوں نے ام۔ اے کر لیا۔ ام۔ اے کرنے کے بعد انہیں پنجاب کے محکمۂ تعلیم میں ملازمت مل گئی، اور کئی سال تک وہ ملتان اور شیخوپورہ کے گورنمنٹ کالجوں میں اُردو اور فارسی کا درس دیتے رہے۔ اس عرصے میں انہوں نے پی ایچ ڈی میں بھی داخلہ لے لیا، اور مومن دہلوی کی شخصیت اور شاعری پر کام کرنے لگے۔ کئی سال محنت کر کے انہوں نے اپنا تحقیقی مقالہ پی ایچ ڈی کی ڈگری کے لئے پیش کیا، اور اس پر پنجاب یونیورسٹی نے انہیں ڈاکٹریٹ کی ڈگری دے دی۔

یہ ڈگری مل گئی تو وہ پنجاب گورنمنٹ کی ملازمت کو چھوڑ کر اُردو کے اُستاد کی حیثیت سے اورینٹل کالج میں آ گئے، اور شعبۂ اُردو میں کئی سال میرے رفیق کار رہے۔ اُن کے اس تقرر سے اساتذہ اور طلباء سب کو خوشی ہوئی۔

ناظر صاحب نے کلاسیکی اُردو اور فارسی شاعری اور نثر کا مطالعہ بڑی محنت سے کیا تھا، اور ایک عمر اس کام میں صرف کر دی تھی۔ یہی وجہ ہے کہ وہ ام۔ اے کی تدریس کے لئے بہت مفید ثابت ہوئے۔ اُن کے حافظے کا یہ عالم تھا کہ نہ صرف فارسی اور اُردو کے شعراء کے ہزارہا اشعار انہیں زبانی یاد تھے بلکہ اہم نثر نگاروں کے صفحے کے صفحے انہیں ازبر تھے، اور وہ اپنے لیکچروں میں طالب علموں کے سامنے یہ اشعار اور نثر کے

نمونے اس طرح پڑھتے تھے جیسے کتابیں اُن کے سامنے رکھی ہیں۔ بے شمار کتابوں کے حوالے بھی اُن کے سینے میں محفوظ تھے۔ یہی وجہ ہے کہ طالب علموں کو اُن کے لیکچروں سے بہت فائدہ ہوا، اور اُن کے دلوں میں ادب اور شاعری کے مطالعے کا ایسا ذوق و شوق پیدا ہوا جس نے اُن کی دُنیا ہی بدل دی۔

اور پھر اُن کے لہجے میں ایسی شیرینی، اُن کی آواز میں ایسا بانکپن اور اُن کی گفتگو میں ایسی روانی تھی جس نے اُن کے لیکچروں کو بہت ہی دلکش اور دل آویز بنا دیا، اور طالب علم اُن کے دلدادہ نظر آنے لگے۔ اُن کے مزاج میں شفقت اور محبت بھی بہت تھی۔ اور اسی کا یہ نتیجہ تھا کہ طالب علم اُن کے بہت قریب تھے۔ اُن سے محبت کرتے تھے، اُن سے استفادہ کرتے تھے، ان کی بات مانتے تھے اور اُن کے کہنے پر عمل کرتے تھے۔

ناظر صاحب کا زیادہ وقت لکھنے پڑھنے میں گذرتا تھا۔ ہر وقت مطالعے میں مصروف رہتے تھے، اور جو کچھ پڑھتے تھے وہ اُن کے سینے میں محفوظ ہو جاتا تھا۔ یاد رکھنے کی ایسی صلاحیت جو ناظر صاحب میں تھی، میں نے بہت کم لوگوں میں دیکھی ہے۔ مطالعے کے سلسلے میں خاصا وقت وہ یونیورسٹی لائبریری میں گذارتے تھے۔ اپنا کام تو لائبریری میں بیٹھ کر کرتے ہی تھے، دوسروں کا کام بھی نہایت شوق سے کرنے کے لئے تیار ہو جاتے تھے۔

میں اورینٹل کالج کی پرنسپلی کے زمانے میں انتظامی کاموں میں بہت مصروف رہتا تھا ناظر صاحب کو اس کا احساس تھا۔ چنانچہ جب بھی وہ لائبریری جاتے تھے تو مجھ سے پوچھتے تھے کہ "آپ کو کسی کتاب یا کسی حوالے کی ضرورت تو نہیں ہے؟ مجھے بے تکلفی سے بتائیے، آپ کا مطلوبہ مواد حاصل کر کے پیش کر دوں گا۔"

چنانچہ اس زمانے میں اُنھوں نے بے شمار علمی کاموں میں میرا ہاتھ بٹایا۔ بے شمار حوالے میرے لئے تلاش کئے، اور اس طرح میرے علمی ادبی کام کا سلسلہ جاری رہا۔ میری کتابیں جو چھپنے کے لئے پریس میں جاتی تھیں، ان کی کاپیاں اور پروف بھی وہ بڑے شوق سے پڑھتے تھے۔ غرض اُنھوں نے کئی سال تک میرے ساتھ علمی

معاملات میں تعاون کیا، اور اُن کی مدد اور ہمت افزائی کی بدولت ہر سال میری دو چار کتابیں چھپ کر سامنے آتی رہیں۔ اگر ناظر صاحب کا تعاون مجھے نصیب نہ ہوتا تو میرا علمی کام رُک جاتا اور میں صرف کالج کے انتظامی کاموں میں اُلجھا رہتا۔

اس زمانے میں اُنہوں نے جن علمی اور تحقیقی کاموں میں میرا ہاتھ بٹایا اُن میں سیّد حیدر بخش حیدری کی نادر و نایاب کتاب "گلزار دانش" کے قلمی نسخے کی تصحیح اور ترتیب و تدوین تھی۔ لندن کے دوران قیام میں یہ نادر و نایاب قلمی نسخہ مجھے کوپن ہیگن کی رائل لائبریری میں ملا تھا۔ اس کو حاصل کرنے کے لئے مجھے کوپن ہیگن (ڈنمارک)، کا سفر کرنا پڑا تھا، اور اس کو حاصل کر کے مجھے بڑی مسرّت ہوئی تھی۔ کیونکہ اِس سے قبل تقریباً تمام ادبی مؤرخوں نے یہ لکھا تھا کہ اس کا کوئی نسخہ کسی کتب خانے میں موجود نہیں ہے۔ میں نے نہ جانے کیا کیا کچھ کر کے اس کا سُراغ لگایا اور اس کی دونوں جلدوں کے مائیکروفلم حاصل کئے۔ ناظر صاحب نے اس مائیکروفلم کو پنجاب یونیورسٹی لائبریری میں بیٹھ کر پڑھا۔ پھر اُس کے فوٹو نکلوائے۔ ایک صاحب سے اس کی نقل کروائی، اور اس کا مسوّدہ تیار کر کے مجھے دیا۔ اس طرح مجھے اس پر کام کرنے میں آسانی ہوئی، اور کئی سال کی اَن تھک محنت کے بعد میں نے اس کو کتابت اور طباعت کے لئے تیار کیا۔ کئی سال کی صبر آزما محنت کے بعد اس نادر و نایاب کتاب کی دو جلدیں پنجاب یونیورسٹی کے اورینٹل پبلیکیشنز فنڈ سے شائع ہوئیں، اور اب یہ جلدیں اورینٹل کالج میں محفوظ ہیں۔ ناظر صاحب نے اس کی کتابت شدہ کاپیاں اور پروف بھی پڑھے، اور اس کی طباعت کے سلسلے میں بھی بڑی محنت کی۔ اُن کا تعاون مجھے حاصل نہ ہوتا تو شاید اس کتاب کی طباعت و اشاعت میں کئی سال کی مزید تاخیر ہو جاتی۔

اس کے ساتھ ساتھ انہوں نے مظہر علی خاں ولا کے دیوان کی ترتیب و تدوین اور طباعت و اشاعت میں بھی میرا ہاتھ بٹایا۔ اس نادر و نایاب کتاب کا قلمی نسخہ بھی مجھے کوپن ہیگن کی رائل لائبریری میں ملا تھا۔ اور میں اس کا مائیکروفلم بھی لندن سے اپنے ساتھ لایا تھا۔ ناظر صاحب نے اس کو بھی مائیکروفلم ریڈر پر پڑھا۔ پھر اس کے فوٹو نکلوائے اور مرتضیٰ صاحب سے اس کو نقل کروایا۔ جس کی وجہ سے مجھے اس کی ترتیب و تدوین کے

کام میں آسانی ہوئی۔ یہ کتابت بھی پنجاب یونیورسٹی کے اورینٹل پبلیکیشنز فنڈ سے نہایت اہتمام سے شائع ہوئی۔

ناظر صاحب کے تعاون اور مدد سے میں ان دونوں نادر و نایاب قلمی نسخوں کی ترتیب و تدوین اور طباعت و اشاعت میں کامیاب ہوا۔

اِن کتابوں کے علاوہ انُھوں نے حیدری کی مختصر کہانیاں' دیوان حیدری' تذکرہ' حیدری گلشن ہند' مظہر علی خاں ولا کی ہفت گلشن ، مادھونل اور کام کندلا، مرزا کاظم علی جوان کی شکنتلا ، بینی نارائن جہاں کی چار گلشن' خلیل علی خاں اشک کی گلزار چین، رسالۂ کائنات اور عبیداللہ خاں مبتلا کا دیوان مبتلا ، گلکرسٹ کی نقلیات ہندی' اور حکیم الٰہی بخش شوق کی "افسانۂ عشق" کے نادر و نایاب قلمی نسخوں کی ترتیب و تدوین اور طباعت و اشاعت میں میری مدد کی۔

اورینٹل کالج کے دورانِ قیام میں ناظر صاحب نے اپنے علمی کام کو بھی جاری رکھا۔ خاصی تعداد میں تحقیقی اور تنقیدی مقالے لکھے جو مختلف رسالوں میں شائع ہوئے۔ اُن کی کئی کتابیں بھی نہایت اہتمام سے شائع ہوئیں جن سے اُردو ادب میں گراں قدر اضافہ ہوا۔

پی ایچ ڈی کے لیئے اُنھوں نے مومن دہلوی پر ضخیم تحقیقی مقالہ لکھا، اور اس میں خوش فکر شاعر کے بارے میں ایسی معلومات فراہم کی جو کہیں اور نہیں مل سکتی۔ مومن کی شخصیت اور شاعری سے مجھے بھی دلچسپی تھی۔ چنانچہ میں نے بھی اس زمانے میں مومن پر ایک ضخیم کتاب لکھی، اور اُن کے تحقیقی مقالے سے استفادہ کیا۔ میری کتاب تو چھپ گئی۔ لیکن افسوس ہے کہ ناظر صاحب کا تحقیقی مقالہ ابھی تک کتابی صورت میں شائع نہیں ہوا۔ اس کی وجہ ناظر صاحب کی بے نیازی تھی۔ میں انہیں اس مقالے کی اشاعت کے لیئے توجہ دلاتا رہا لیکن ناظر صاحب یہی کہتے رہے کہ "یہ مقالہ تو بہت ضخیم ہے، اس کو کون چھاپے گا۔ ہزار صفحات سے زیادہ کی طباعت کسی پبلشر کے بس کی بات نہیں" اداروں کے ارباب اختیار کی خوشامد میں کر نہیں سکتا۔ اس کے لیئے تو ایک خاص قسم کا مزاج چاہیئے ، اور میں اس قسم کے مزاج سے محروم ہوں"۔ میرے خیال میں اُن کے اس مقالے کو شائع ہونا چاہیئے کیونکہ

وہ مومن اور اُن کے عہد کے مطالعے میں بہت مفید ثابت ہو سکتا ہے۔

ڈاکٹر ناظر صاحب بڑی محبت کرنے والے آدمی ہیں۔ گذشتہ چالیس سال میں اُنہوں نے میرے ساتھ بڑی محبت اور عقیدت کا اظہار کیا۔ کالج میں تو خیر اُن سے روزانہ ملاقات ہوتی ہی تھی، لیکن وہ اکثر میری جائے قیام پر بھی آتے تھے، اور نہ صرف مجھ سے ملتے اور باتیں کرتے تھے بلکہ میرے خاندان کے دوسرے افراد کے ساتھ بھی خاصا وقت گذارتے تھے۔ میرے والد صاحب مرحوم سے انہیں بڑی عقیدت تھی۔ گھنٹوں اُن کے پاس بیٹھتے تھے، اور اُن سے مختلف موضوعات پر باتیں کرتے تھے۔ اُن کے پاس کچھ وقت گذار کر وہ میرے پاس آتے تھے، اور کہتے تھے "آج تو خاں صاحب کی باتوں میں لُطف آگیا۔ ماضی کی کتاب میرے سامنے کھُل گئی۔ ایسے ایسے تجربات انہوں نے میرے سامنے بیان کئے جن سے میرے علم میں اضافہ ہوا۔ بزرگوں کے ساتھ بیٹھنے اور اُن سے باتیں کرنے میں ایسی لذّت ملتی ہے جو کہیں اور نہیں مل سکتی۔ خاں صاحب نے دُنیا دیکھی ہے۔ اُن کے تجربات سے میں فائدہ اُٹھانے کی کوشش کرتا ہوں۔ اُن کی نوازش ہے کہ وہ مجھے اتنا وقت دیتے ہیں"۔

ناظر صاحب جب بھی میرے ہاں آتے، ان کے ہاتھ میں کوئی نہ کوئی چیز ضرور ہوتی تھی۔ کبھی مٹھائی کا ڈبہ، کبھی پھلوں سے بھرا ہوا لفافہ۔ اِن چیزوں کو وہ چُپکے سے ایک طرف رکھ دیتے تھے۔ کچھ کہتے نہیں تھے۔

میں پوچھتا تھا "ناظر صاحب! اس میں کیا ہے"؟

اور وہ ہمیشہ نظریں نیچی کر کے کہتے "اس میں کچھ بھی نہیں ہے۔ کوئی خاص چیز نہیں۔ میری محبت اور عقیدت کے چند پھول ہیں"۔

یہ سُن کر میں ہمیشہ کہتا آپ اتنا تکلف کیوں کرتے ہیں؟

اور وہ ہمیشہ یہ کہتے تھے کہ "یہ تکلف نہیں ہے۔ آپ سے میری محبت اور عقیدت کا اظہار ہے"۔

میں یہ سُن کر چُپ ہو جاتا تھا۔

ناظر صاحب بڑے مرنجاں مرنج آدمی ہیں۔ مذہبی معاملات میں بڑے روشن خیال ہیں، اور اُن کی یہ ادا مجھے پسند ہے اور میں اُن کے اس انداز کا شیدائی ہوں۔

وہ سیدھے سادے اور سچے مُسلمان ہیں۔ اسی لئے مختلف دبستان فکر کے جُزوی اختلافات سے کوئی تعلق نہیں رکھتے۔ نماز کا وقت آجائے تو کسی مسجد میں، کسی بھی خیال کے امام کے پیچھے نماز پڑھ لیتے ہیں۔ بارہا ایسا ہوا ہے کہ اُنہوں نے بریلویوں اور دیوبندیوں کی مسجدوں میں باجماعت نماز پڑھی ہے۔

ایک دفعہ کہیں نماز کا وقت ہوگیا تو بریلویوں کی مسجد میں چلے گئے، اور نماز پڑھی۔ نماز سے فارغ ہوئے تو کسی کٹر بریلوی مسلمان نے پوچھا "آپ کس مسلک سے تعلق رکھتے ہیں؟"

اُنہوں نے برجستہ کہا۔ "میں صرف مسلمان ہوں۔ مختلف مسلکوں کے اختلافات کو اہمیت نہیں دیتا۔ ہر مسلک کی مسجد میں ہر مسلک کے امام کے پیچھے نماز پڑھ لیتا ہوں۔ یہی صحیح اسلام ہے۔ آپ کو مجھ پر کیا اعتراض ہے؟"

وہ شخص اُن کی یہ باتیں سُن کر چُپ ہوگیا، اور بہت شرمندہ اور پشیمان ہوا۔

ناظر صاحب نے یہ واقعہ مجھے مزے لے لے کر سُنایا، اور میں اس کی تفصیل سُن کر بہت محظوظ ہوا۔

اور میں نے کہا "مجھے بھی ایک ایسا ہی واقعہ پیش آیا۔ میں جب زیارت کے لئے نجف اشرف میں حاضر ہوا تو مغرب کا وقت ہو چکا تھا۔ میں نے سوچا پہلے حضرت علی کرم اللہ وجہہ کی مسجد میں مغرب کی نماز ادا کرلوں، اُس کے بعد اطمینان سے مزار اقدس پر فاتحہ پڑھوں اور دُعا مانگوں۔ مسجد میں پہنچا تو دیکھا کہ آٹھ دس جماعتیں الگ الگ کھڑی ہوئی نماز ادا کرنے کی تیاری کر رہی ہیں۔ میں نے ایک صاحب سے پوچھا "ایسا کیوں ہے؟ اُنہوں نے جواب دیا یہاں ہر ایک کا امام الگ ہے۔ لوگ اپنے امام کے پیچھے نماز پڑھتے ہیں۔ میں نے کہا "میرے بارے میں آپ کا کیا حکم ہے؟ میں سُنّی مسلمان ہوں۔ اُنہوں نے کہا "جو جی چاہے کیجئے۔ یہ سُن کر میں اُن میں سے ایک جماعت میں شریک ہو

گیا، اور اطمینان سے ان کے پیچھے مغرب کی نماز پڑھی"۔

ناظر صاحب کو جب میں نے یہ واقعہ سُنایا تو وہ بہت محظوظ ہوئے۔

اورینٹل کالج سے ریٹائر ہونے کے بعد ڈاکٹر ناظر صاحب امریکہ چلے گئے اور نیویارک میں رہنے لگے۔ اُن کے بیٹے ملازمت کے سلسلے میں وہاں پہلے ہی چلے گئے تھے۔ وہ اُن کے ساتھ کئی سال سے وہاں مقیم ہیں، اور کولمبیا یونیورسٹی سے شائع ہونے والی کسی انسائیکلوپیڈیا کے لئے کام کرتے ہیں جس سے اُنہیں خاصی آمدنی ہو جاتی ہے۔ لیکن وہ وطن سے دُور خوش نہیں رہتے۔ ہر دوسرے سال ہزار ہا روپیہ خرچ کر کے پاکستان آتے ہیں، اور عزیزوں اور دوستوں کے ساتھ اچھا وقت گذارتے ہیں اور ان کے درمیان خوش رہتے ہیں۔

چند سال ہوئے وہ پاکستان آئے اور مجھ سے مِلے تو میں نے انہیں بہت اُداس اور افسردہ محسوس کیا۔ میں نے اُن سے پوچھا" کیا بات ہے، آپ کچھ مضمحل سے نظر آرہے ہیں"۔ کہنے لگے" امریکہ میں میرا دل نہیں لگتا۔ مجبوراً وہاں رہتا ہوں"۔

وہاں چھوٹے چھوٹے بند کمروں میں رہنا پڑتا ہے۔ سردی بھی بہت ہوتی ہے۔ وہاں کی معاشرت اور تہذیب بھی مجھے پسند نہیں۔ میں مشرقی مزاج کا آدمی ہوں، اور مشرقی روایات کو پسند کرتا ہوں۔ وہاں یہ سب کچھ ناپید ہے۔ عجب طرح کی بے ہنگم سی سوسائٹی ہے جس سے میں کوئی ذہنی مناسبت نہیں رکھتا۔ وہاں تنہائی بھی بہت ہے۔ کس سے ملوں، کس سے بات کروں، کس کے ساتھ وقت گذاروں؟ میرے لئے تو وہ ملک ایک قید خانہ ہے، ایک کنج قفس ہے۔ اس کنج قفس میں مجھے اپنے عزیزوں اور دوستوں کی یاد کچھ زیادہ ہی آتی ہے۔ پاکستان میں تو یہ اطمینان رہتا تھا کہ جب طبیعت گھبرائی اُن سے مِلنے کے لئے ہندوستان چلا گیا۔ وہاں جاتا ہوں اور عزیزوں سے مِلتا ہوں تو ہر دن عید اور ہر رات مجھے شب برات معلوم ہوتی ہے۔ دو تین سال ہوئے وہاں گیا تھا۔ عزیزوں سے مِلا۔ آموں کے باغوں میں بیٹھا۔ کنوؤں کا ٹھنڈا پانی پیا۔ تازہ ہوا کھائی۔ پُرانی یادوں کو تازہ کیا، اور تازہ دم ہو کر واپس آیا۔ کئی سال ہوئے میں خیر پور سندھ بھی گیا تھا۔ وہاں

بھی میرے کچھ عزیز ہیں۔ اُن کے ساتھ بھی جو وقت میں نے گذارا، اُس کی لذت کو کبھی بُھلا نہیں سکتا۔ لاہور کے گلی کوچے اور احباب بھی مجھے امریکہ میں بہت یاد آتے ہیں"۔

اگر کسی طرح یہاں دو ہزار روپے مہینے کا انتظام ہو جائے تو میں کبھی امریکہ نہ جاؤں یہیں کام کروں اور یہیں رہوں"۔

یہ سُن کر میں نے اپنے حلقے میں بہت کوشش کی کہ اُن کے لئے یہاں کوئی صورت نکل آئے لیکن افسوس ہے کہ مجھے اپنے اس مقصد میں کامیابی نہ ہو سکی، ہر کوشش ناکام ہو گئی۔

اور ناظر صاحب کو مجبوراً امریکہ ہی میں رہنا پڑا۔

ایک دفعہ ناظر صاحب نے امریکہ سے کسی کے ہاتھ TASTER'S CHOICE کی امریکی کافی مجھے بھیجی۔ بڑی لذیذ کافی تھی۔ میں نے انہیں خط لکھا، اور اس کافی کی تعریف کی۔

اب ناظر صاحب جب بھی پاکستان آتے ہیں تو یہ کافی میرے لئے ضرور لاتے ہیں۔ کوئی آنے جانے والا مل جاتا ہے تو اُس کے ہاتھ بھی بھیجتے ہیں۔ ایک دفعہ تو سندھ کے وزیر جاپان والا صاحب کی طرف سے مجھے ایک پارسل ملا۔ اس کو کھولا تو اُس میں امریکن کافی تھی۔ جاپان والا صاحب امریکہ گئے تھے، ناظر صاحب نے اس موقع کو غنیمت جانا اور کافی اُن کے ساتھ کر دی جو پاکستان آکر اُنہوں نے پارسل سے میرے پاس بھجوا دی۔

ایسی محبت کے لوگ آج کل کہاں ملتے ہیں؟

آج کل میں اپنا زیادہ وقت علمی ادبی کاموں میں گذارتا ہوں، اور رسال میں میری دو چار کتابیں شائع ہو جاتی ہیں۔ ناظر صاحب میری اِن کتابوں کو شوق اور دلچسپی سے پڑھتے ہیں، اور دبی زبان سے تعریف بھی کرتے ہیں، اور کہتے ہیں" آپ نے اپنی کتابوں سے ایک اچھا خاصا کتب خانہ جمع کر دیا ہے"۔

اور میں جواب میں کہتا ہوں" ناظر صاحب! اِن کتابوں میں کوئی خاص بات نہیں ہے، یہ تو صرف مُدرّسی کی دین ہے۔ ایک مُدرّس کا یہ فرض ہے کہ وہ اپنے موضوع پر

کام کرتا رہے“۔

ڈاکٹر ناظر صاحب میرے عزیز شاگرد ہی نہیں، ایک ایسے مخلص دوست بھی ہیں، جن کی دوستی، اخلاص اور محبت پر فخر کیا جا سکتا ہے۔

اور میں واقعی اُن کی دوستی اخلاص اور محبت پر فخر کرتا ہوں!

ڈاکٹر سُہیل احمد خاں

آج سے تقریباً بیس پچیس سال پہلے کی بات ہے ایک طالب علم اورینٹل کالج کی ام۔اے اُردو کی جماعت میں داخل ہوئے، اور دو تین مہینے بھی نہیں گذرے تھے کہ اُنہوں نے ڈیڑھ سو کے قریب طالب علموں میں ایک نمایاں مقام پیدا کر لیا۔ پڑھنے لکھنے میں گہری دلچسپی لی، اُردو انجمن کے صدر بھی منتخب ہوئے، طالب علموں کا ایک رسالہ بھی لفظ کے نام سے نکالا۔ وولنز ہوسٹل میں رہتے تھے وہاں بھی اُنہوں نے علمی ادبی فضا پیدا کی، کالج کی غیر نصابی سرگرمیوں میں بھی پیش پیش رہے، اور کھیلوں وغیرہ میں بھی دلچسپی کا اظہار کیا۔

یہ میرے عزیز شاگرد سُہیل احمد خاں تھے جو تقریباً پانچ چھ سال ایک طالب علم کی حیثیت سے کالج میں رہے۔ اس کالج سے انہوں نے فرسٹ کلاس میں ام۔اے اُردو کیا۔ ام۔اے میں اُنہوں نے محمد حسن عسکری پر تحقیقی مقالہ لکھا، اور ام۔اے کرنے کے بعد پی ایچ ڈی کے لئے اُردو داستانوں کے علامتی پہلو پر ایک خیال انگیز تھیسز لکھا جس پر اُنہیں پنجاب یونیورسٹی کی طرف سے ڈاکٹریٹ کی ڈگری ملی۔ طالب علمی کے زمانے ہی میں اُنہوں نے اپنا ادبی کام شروع کیا، اور جلد ہی لاہور کے ادبی ماحول میں انہوں نے اپنی جگہ بنالی۔ اتنے قلیل عرصے میں ادبی دُنیا میں اپنی جگہ کوئی جوہر قابل ہی بنا سکتا ہے۔

میں ایسے طالب علموں پر نظر رکھتا تھا، اور میری یہ کوشش ہوتی تھی کہ جس طالب علم کا

مزاج ادبی ہو، اُس کی رہنمائی خصوصی طور پر کی جائے تاکہ وہ ادبی کام میں زیادہ سے زیادہ دلچسپی لے کر ادب کی دُنیا میں نام پیدا کرے۔ چنانچہ جب سُہیل خاں نے اچھے نمبروں سے ایم۔ اے پاس کر لیا، اور پی ایچ ڈی کرنے کی بھی خواہش ظاہر کی تو میں نے یہ سوچا کہ شعبۂ اُردو میں لکچرار کی حیثیت سے عارضی طور پر اُن کا تقرر کر لیا جائے تاکہ اورینٹل کالج کے شعبۂ اُردو میں رہ کر انہیں اطمینان سے ادبی کام کرنے کا موقع مِلے۔ اس وقت شعبۂ اُردو میں اُستاد کی ایک جگہ خالی تھی، اور صدر شعبہ کو اس پر تقرر کرنے کا اختیار تھا۔ میں نے اس صورت حال کو غنیمت جانا اور اُردو کے لکچرار کی حیثیت سے اُن کا تقرر کر لیا، اور اس طرح وہ میرے رفیق کار ہو گئے۔

شعبۂ اُردو کے بیشتر اساتذہ نے میرے اس انتخاب کو پسند کیا۔ طالب علم خوش ہوئے، اور مجھے ایسا کرنے سے بڑی مسرت ہوئی۔ اس لئے کہ مجھے اس بات کا یقین تھا کہ وہ شعبے کے لئے مفید ثابت ہوں گے، ان کی وجہ سے صحیح ادبی ماحول پیدا ہو گا، اور وہ شعبے اور کالج کے انتظامی معاملات میں بھی میری مدد کریں گے۔ مجھے خوشی ہوئی کہ جو اعتماد میں نے اُن پر کیا تھا، وہ اُس پر پورے اُترے اور اُنھوں نے شعبۂ اُردو اور اورینٹل کالج کے انتظامی معاملات میں ہمیشہ میرا ہاتھ بٹایا، اور مجھے اپنے ادبی منصوبوں کو عملی جامہ پہنانے میں بھی اُن سے بڑی مدد ملی۔

لیکن عجیب بات ہے کہ شعبے کے دو اُستاد اُن کے تقرر سے خوش نہیں ہوئے۔ میرے پاس ایک دن دفتر میں آئے اور کہا "ہم نے سُنا ہے کہ آپ نے سہیل احمد خاں کا تقرر لکچرار کی حیثیت سے شعبۂ اُردو میں کر لیا ہے"۔

مَیں نے کہا "آپ کی اطلاع صحیح ہے سُہیل صاحب اچھے طالب علم رہے ہیں۔ اُن کا مزاج ادبی ہے۔ آپ کے بھی شاگرد رہے ہیں۔ میرا خیال ہے وہ شعبے کے لئے مفید ثابت ہوں گے۔ اسی لئے میں نے ایسا کیا ہے"۔

اِن میں سے ایک صاحب نے جو سات آٹھ سال میرے شاگرد بھی رہ چکے تھے کہا "اُس کا مطلب تو یہ ہے کہ اب وہ ہمارے برابر ہو گئے"۔

میں نے کہا یہ بات بھی صحیح ہے۔ اُستاد سب برابر ہی ہوتے ہیں۔ شاگرد اُستاد ہو جائے اور اپنے اساتذہ کا رفیق کار بن جائے تو اُستاد کو اس پر فخر کرنا چاہیئے۔ میں شعبۂ اُردو کا پروفیسر اور صدر اور کالج کا پرنسپل ہوں لیکن اب شعبے کے اُستاد کی حیثیت سے اب وہ میرے بھی رفیق کار ہیں، اور ہم سب ایک صف میں شامل ہیں۔ مجھے اس کی بڑی خوشی ہے۔"

میری ان باتوں سے وہ کچھ خوش نہیں ہوئے۔ ذرا دیر چُپ رہے۔ پھر بولے "میرا یہ شاگرد خود سر بہت ہے۔ شرارت بھی بہت کرتا ہے۔ اس نے کئی دفعہ ہوسٹل میں بجلی کے بلب بھی توڑے ہیں۔ میں تو اس کو ہوسٹل بلکہ کالج سے نکلوانا چاہتا تھا۔ لیکن مجھے معلوم تھا کہ آپ ایسا نہیں ہونے دیں گے۔ اس لئے خاموش رہا۔"

میں نے کہا "جس کو آپ خود سری کہتے ہیں، وہ درحقیقت احساس خودی ہے جس پر علامہ اقبالؒ نے بہت زور دیا ہے۔ اور طالب علمی کے زمانے میں شرارتیں تو سب ہی کرتے ہیں۔ ہم جب طالب علم تھے تو شرارتیں تو ہم بھی کرتے تھے۔ آپ تو بلب توڑنے کی بات کرتے ہیں۔ ہم تو اپنے زمانے میں ٹرینیں تک روک لیتے تھے اور جو کچھ چاہتے تھے، وہ کروا لیتے تھے۔ یہ زمانہ ہی ایسا ہوتا ہے۔ یہ عمر ہی ایسی ہوتی ہے۔ وقت سب کو ٹھیک کر دیتا ہے۔ اب وہ اُستاد ہو گئے ہیں۔ ایسی کوئی بات نہیں کریں گے۔ میں نے بہت سوچ سمجھ کر ان کا تقرر کیا ہے۔"

میری یہ باتیں سُن کر وہ کچھ مایوس سے ہوئے اور زیرلب کچھ کہتے ہوئے واپس چلے گئے۔ کیونکہ انہیں یقین ہو گیا تھا کہ میرا فیصلہ اٹل ہے، اور میں اس کو بدلنے کے لئے تیار نہیں ہوں۔ سہیل صاحب سے میں نے اس واقعے کا کبھی کوئی ذکر نہیں کیا۔ اس خیال سے کہ اُن کی طبیعت پر اس کا اچھا اثر نہیں ہوگا، اور اُن کے تعلقات ان اساتذہ سے مجروح ہوں گے اور خواہ مخواہ آپس میں کھنچاؤ پیدا ہوگا۔ اور میں رفقائے کار کے درمیان اس طرح کی کشیدگی کو پسند نہیں کرتا تھا۔

بہرحال سہیل احمدؔ خاں شعبے میں رہے اور اب تک موجود ہیں۔ انہوں نے شعبے اور کالج کے لئے نہایت مفید کام کیا ہے اور اب بھی شعبے کے لئے مفید کام کر رہے ہیں۔

طالب علم اُن کے پرستار ہیں۔ اساتذہ اُن کے گرویدہ ہیں۔ اور علم و ادب کی دُنیا اُن کی مدح خواں ہے، اور وہ ایک قابل اُستاد اور ایک اچھے ادیب اور نقاد کی حیثیت سے پہچانے جاتے ہیں۔ ہر شخص اُن کی عزت کرتا ہے۔

سُہیل صاحب کا مزاج ادبی ہے اور وہ خود اعلےٰ درجے کے ادیب ہیں۔ نقاد اور شاعر ہیں۔ گذشتہ پندرہ بیس سال میں اُنہوں نے جو ادبی کام کیا ہے وہ خاصا اہم ہے۔ اُس میں جدّت اور اچھوتا پن ہے۔ اُس میں مطالعے کی وسعت ہے، فکر کی گہرائی ہے، تخیل کی بلند پروازی ہے۔ انہوں نے کلاسیکی اُردو ادب کا مطالعہ محنت سے کیا ہے۔ وہ جدید اُردو ادب سے بھی گہری دلچسپی رکھتے ہیں۔ یورپ کے ادب، خصوصاً اسپینی اور فرانسیسی ادب کے بھی وہ سنجیدہ اور محنتی طالب علم ہیں۔ داستانوں پر اُن کا تحقیقی کام "داستانوں کی علامتی کائنات" کے نام سے شائع ہو چکا ہے۔ علامتوں پر اُن کا مطالعہ علامتوں کی تلاش "سرچشمے" کے نام سے چھپ گیا ہے۔ قدیم اور جدید اُردو ادب اور یورپی ادب پر اُن کے مضامین کے مجموعے 'طرزیں' اور 'طرفیں'، کے نام سے چھپ کر سامنے آچکے ہیں۔ مختلف لکھنے والوں کی تحریروں کا ایک مجموعہ 'داستان در داستان' کے نام سے بھی مرتب کر کے اُنہوں نے شائع کیا ہے۔ یہ تمام تحریریں انہیں ادبیات کا ایک سنجیدہ طالب علم اور قدیم و جدید ادبیات کا ایک اہم نقاد ثابت کرتی ہیں۔ سہیل نئے احساسات کے شاعر بھی ہیں۔ اُن کی نظموں کا مجموعہ "ایک موسم کے پرندے" شائع ہو چکا ہے اور نئے احساس اور نئے شعور کے علم برداروں سے خراجِ تحسین وصول کر چکا ہے۔

اور یہ سارا ادبی کام درحقیقت مُدرسی کی دین ہے۔ ایک اچھا اُستاد اسی طرح کام کرتا ہے۔ ظاہر ہے کہ جس اُستاد کی نظر میں اتنی وسعت اور گہرائی ہو گی، وہ اپنے طالب علموں کی نظر میں بھی وسعت پیدا کر دے گا۔ سُہیل ایک محنتی اور شفیق اُستاد ہیں۔ طالب علموں نے اُن سے بہت استفادہ کیا ہے، اور اُن کی تدریس کی بدولت وہ ادبی ذوق اور مطالعے کے شوق سے مالا مال ہوئے ہیں۔ سُہیل نے یہ کام بڑے سلیقے سے انجام دیا ہے۔ اور ادب سے دلچسپی لینے والوں کی ایک کھیپ پیدا کر دی ہے۔ جو نہ صرف

مطالعے کی حدتک ادب کے رسیا ہیں بلکہ خود ادب کی تخلیق کی طرف بھی گام زن ہیں۔

میرا ذاتی تجربہ یہ ہے کہ سُہیل ایک ادیب اور نقاد اور اُستاد ہونے کے ساتھ ساتھ انتظامی معاملات کے بھی مزاج داں ہیں۔ انتظامی گتھیوں کو سُلجھانا انہیں خوب آتا ہے۔ طالب علموں کو اپنے شیشے میں اُتارنا اور انہیں اپنے اشاروں پر چلانا وہ خوب جانتے ہیں۔ انہوں نے میری پرنسپلی کے زمانے میں اورینٹل کالج کے طالب علموں کی صحیح رہنمائی کی۔ اپنی معاملہ فہمی سے مختلف سیاسی گروپوں کے طالب علموں کو اپنے ہاتھ میں رکھا۔ اُن کی سیاسی تربیت بھی کی، اور سب سے بڑی بات یہ ہے کہ اُنھوں نے ایک دوسرے کو دُشنام طرازیوں اور جماعتی آویزشوں سے باز رکھا۔ اس کی وجہ سے میرا وقت سیاسی جھگڑوں کو طے کرانے میں ضائع نہیں ہوتا تھا اور طالب علم ان آویزشوں کے باوجود اپنا زیادہ وقت پڑھنے لکھنے میں صَرف کرتے تھے۔

میرے زمانے میں کئی سال تک وہ کالج یونین کے نگراں اور وولنز ہاسٹل کے سپرنٹنڈنٹ اور وارڈن رہے، اس زمانے میں یونیورسٹی کے مختلف شعبے اور کالج سیاست کے اکھاڑے بن گئے تھے اور اس صورت حال کی وجہ سے آئے دن ہنگامے ہوتے رہتے تھے۔ لیکن سُہیل نے اپنی دانش مندی اور معاملہ فہمی سے اورینٹل کو اس مسموم فضا سے محفوظ رکھا، طالب علموں کو ادب کے مطالعے کی طرف راغب کیا، اور مطالعۂ ادب کے ذوق وشوق نے اُن کے اندر تہذیب وشائستگی پیدا کی اور وہ انسانی اقدار سے مالا مال ہوئے۔

اور اس طرح طالب علموں کو صحیح انسان بنانے کی وہ خواہش بھی تکمیل سے ہم کنار ہوئی جس کو میں اپنی تعلیمی زندگی میں سب سے زیادہ اہمیت دیتا تھا۔

سُہیل نوجوان تھے، اور طالب علمی کی زندگی کو چھوڑے ہوئے انہیں ابھی چند سال ہی ہوئے تھے، اس لئے طالب علم انہیں ابھی تک اپنے قبیلے کا آدمی سمجھتے تھے۔ طالب علموں سے اُن کا رابطہ صحت مندانہ بُنیادوں پر اُستوار تھا۔ وہ اُن کی بات مانتے تھے، اُن کی ہدایات پر عمل کرتے اور اُن کے بنائے ہوئے راستوں پر چلتے تھے۔ اس صورت

حال کی وجہ سے میرے انتظامی معاملات میں کبھی کوئی خلل واقع نہیں ہوا، اور انتظامی امور نہایت خوش اسلوبی سے انجام پاتے رہے۔

اپنی پرنسپلی کے زمانے میں میری یہ خواہش تھی کہ اورینٹل کالج ایک ادبی مرکز کی حیثیت اختیار کرلے۔ چنانچہ میں نے اس کے لئے ایک منصوبے کے تحت کام کیا جس کے نتیجے میں مختلف خیالات و نظریات رکھنے والے ادیب اور شاعر اورینٹل کالج کے ساتھ وابستہ رہے۔ ادبی جلسوں اور سیمناروں کا سلسلہ بڑے پیمانے پر شروع ہوا، جن میں ادب کے مختلف مسائل پر بحثیں ہوئیں، اعلےٰ درجے کے مقالے پڑھے گئے۔ مشہور و معروف شعراء نے اپنے بارے میں اور اپنی شعری تخلیقات کے بارے میں باتیں کیں، اور اپنا نیا سے نیا کلام بھی سُنایا۔ شاید ہی پاکستان کا کوئی ایسا شاعر یا ادیب ہوگا جس نے ہمارے اِن ادبی جلسوں اور سیمناروں میں شرکت نہ کی ہو۔ اس سے طالب علموں کو بہت فائدہ ہوا، اور اورینٹل کالج میں نہ صرف پاکستان اور ہندوستان بلکہ دوسرے ممالک میں بھی منفرد انداز کا ایک تعلیمی و تدریسی اور علمی و ادبی ادارہ تصوّر کیا جانے لگا۔

سُہیل احمد خاں نے اس کام میں ہمیشہ میرا ہاتھ بٹایا، اور اِن منصوبوں کو عملی جامہ پہنانے میں میری مدد کی۔ ان کے تعاون سے اورینٹل کالج کی بین الاقوامی شہرت میں بھی اضافہ ہوا۔ دُنیا کے مختلف ممالک کے دانش ور جب بھی پاکستان آئے، اُنھوں نے ہمیشہ اورینٹل کالج کو نوازا۔ یہاں لیکچر دیئے، یہاں کے سیمناروں میں شرکت کی، اور اپنے گراں قدر خیالات سے اُستادوں، طالب علموں اور دانش وروں کو مُستفید کیا۔ ان لوگوں نے اورینٹل کالج کے بارے میں اپنے تاثرات کالج کی وزیٹرز بُک میں لکھ دیئے جس کی حیثیت اب ایک مستقل ریکارڈ کی ہے، اور جس سے یہ اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ وہ اس ادارے کو کتنی اہمیت دیتے تھے۔

سُہیل صاحب سچے اور کھرے آدمی ہیں۔ دوستوں کے دوست ہیں۔ دیانت داری اُن کی گھٹی میں پڑی ہے۔ وہ محنت کے عادی ہیں۔ جو کام اُن کے سُپرد کیا جائے، اُس کو بڑی محنت سے انجام دیتے ہیں۔ اور جب تک وہ مکمل نہ ہو جائے

چین سے نہیں بیٹھتے۔ وہ بزرگوں کی عزّت کرتے ہیں اور چھوٹوں کے ساتھ شفقت سے پیش آتے ہیں۔ حفظِ مراتب کا خاص خیال رکھتے ہیں۔ جماعت بندی سے اُنہیں نفرت ہے۔ وہ اصول پرست ہیں۔ اپنے نظریات میں پختہ ہیں۔ کسی کی لگی لپٹی نہیں رکھتے۔ زمانہ سازی سے انہیں کوئی سروکار نہیں۔ وہ کبھی نیچے نہیں گرتے۔ کبھی سُبک سر نہیں ہوتے۔ برخلاف اس کے بہت لئے دیئے رہتے ہیں۔ احترام آدمی اور عزت نفس کا خیال اُن کے ساتھ ساتھ سائے کی طرح چلتا ہے۔ وہ مہذب اور شائستہ ہیں، اور سنجیدگی سے کبھی بھی اپنا رشتہ نہیں توڑتے۔ وہ انسان دوست ہیں، اور انسانی اقدار کا خون ہوتے ہوئے نہیں دیکھ سکتے۔ اگر کوئی ایسا کرے تو اُن کے خیال میں یہ سب سے بڑا گُناہ ہے۔

شعبۂ اُردو اور کالج کے روزمرّہ کے معاملات میں تو اُنھوں نے ہمیشہ غیر معمولی دلچسپی لی اور ہمیشہ میرے کاموں کو آگے بڑھایا لیکن اورینٹل کالج کے جشنِ صد سالہ کے موقع پر اُنھوں نے میرے منصوبوں کو کامیابی سے ہم کنار کرنے میں جس دُھن اور لگن سے کام کیا۔ وہ اُنہیں کا حصّہ ہے۔ مجھے مُفید مشورے دیئے۔ جو کام اُن کے سُپرد کیا، اس کو اُنھوں نے نہایت خوش اسلوبی اور سلیقے سے انجام دیا۔ بہت سے انتظامی کام اپنے ذِمّے لئے، اور اس موقع پر ماہرینِ علوم مشرقی کی جو کانگریس ہوئی، اس کو کامیاب بنانے میں شب و روز لگن کے ساتھ کام کیا۔ سات دن تک اس کے اجلاس پنجاب یونیورسٹی کے سینٹ ہال میں ہوتے رہے، اور ان اجلاسوں میں امریکہ، روس، برطانیہ، جرمنی، فرانس، ترکی، ایران، سعودی عرب، عراق، شام اور افغانستان کے جو مندوب اپنے خرچ پر لاہور آئے اُن کے قیام و طعام کا معقول انتظام ڈاکٹر عُبیداللہ خاں کے ساتھ مل کر نہایت سلیقے سے کیا۔ سب یہ دیکھ کر حیران ہوئے کہ ایک تدریسی ادارہ اتنے بڑے پیمانے پر بین الاقوامی کانگریس کس طرح کر سکتا ہے۔ سُہیل صاحب نے اپنے رُفقاء کے تعاون سے یہ خِدمت انجام دی، اور کانگریس کے بعد جب اس کی روداد ایک ضخیم اور خوشنما جلد کی صورت میں شائع کرنے کا کام شروع کیا گیا، تو اس کام میں بھی وہ

پیش پیش رہے۔ مقالات کی ترتیب میں میرا ہاتھ بٹایا، بعض مضامین کے ترجمے بھی اُردو میں کئے۔ پروف بھی پڑھے تزئین و آرائش کا کام بھی کیا۔ چھپائی کے کاموں میں بھی مدد کی۔ یہ خوبصورت اور دیدہ زیب جلد ۱۹۷۴ء میں جشن نامہ اورینٹل کالج کے نام سے شائع ہوئی اور اس نے دُنیا بھر کی یونیورسٹیوں اور تحقیقی اداروں سے داد و تحسین وصول کی۔

غرض سُہیل نے رفاقت کا حق ادا کر دیا اور اُن کی اس رفاقت سے اخلاص مندی، فہم و فراست، لگن اور بے لوث خدمت کی بدولت اس زمانے کے اورینٹل کالج کی زندگی کو اتنا خوبصورت، دلکش اور دل آویز و دل نشین بنا دیا کہ وہ بسر کرنے کی چیز نظر آنے لگی۔

اس دور پُر آشوب میں ایسی خوبیوں کے لوگ ذرا مشکل ہی سے نظر آتے ہیں!

احراز الحسن نقوی

یہ کوئی پچیس تیس سال پہلے کی بات ہے۔ اکتوبر کا مہینہ تھا۔ میں اورینٹل کالج کے اسٹاف روم میں بیٹھا احباب سے باتیں کر رہا تھا کہ ایک نوجوان داخل ہوئے۔ میرے پاس آئے۔ جیب سے ایک خط نکالا، اور کہا کہ مجھے جناب پروفیسر احتشام حسین صاحب نے لکھنؤ سے بھیجا ہے۔ میں ان کا شاگرد ہوں۔

میں نے لفافہ کھولا۔ خط میرے استاد گرامی احتشام حسین صاحب ہی کا تھا ــــ اور اس میں یہ لکھا تھا کہ احراز الحسن صاحب سے ملیئے۔ یہ میرے عزیز شاگرد ہیں۔ لکھنؤ یونیورسٹی سے بی۔ اے پاس کر لیا ہے۔ اب اورینٹل کالج میں ایم۔ اے اُردو کے طالب علم کی حیثیت سے داخلہ لینا چاہتے ہیں ان کا داخلہ کروا دیجئے۔

احراز صاحب کو میں نے اپنے پاس بٹھایا۔ چائے پلائی لکھنؤ کی اور احتشام صاحب کی باتیں کیں چپراسی کو بلایا۔ فارم منگوائے۔ وہیں پُر کروائے۔ اور داخلہ کروا دیا۔ اس زمانے میں داخلے پر آج کل کی سی پابندیاں نہیں تھیں۔ جس کا جی چاہے داخلہ لے سکتا تھا۔ اورینٹل کالج تو اسی کے لئے مشہور تھا۔

دُنیا کے کسی گوشے سے کوئی بھی آئے۔ اگر اس کے پاس بی۔اے کی سند ہے تو وہ اورینٹل کالج میں طالب علم کی حیثیت سے داخل ہو سکتا تھا۔

بہر حال میں نے احراز الحسن کو داخل کروا دیا، اور وہ میرے شاگرد ہو گئے۔

دو سال وہ میرے ساتھ کالج میں رہے۔ کبھی آنکھ ملا کر بات نہیں کی لیکچروں میں پابندی سے شریک ہوئے۔ لیکچر انہماک سے سنتے اور چہرے کا انداز یہ بتاتا کہ باتوں سے لُطف اندوز ہو رہے ہیں۔ ٹوٹوریل میں بھی آتے نہایت احترام کے ساتھ ادب سے متعلق کوئی سوال پوچھتے اور جواب میں جو کچھ کہا جاتا اس کو غور سے سنتے اور ادب سے اپنی گہری دلچسپی کا اظہار کرتے۔

دو سال میں احراز الحسن نے کالج کے ماحول کو اچھی طرح سمجھ لیا تھا۔ ہر ادارے میں کچھ نہ کچھ سیاست ضرور ہوتی ہے۔ اورینٹل کالج میں بھی تھی۔ لیکن احراز الحسن نے اس سیاست میں کبھی کوئی دلچسپی نہیں لی۔ ہر استاد ان کے لئے محترم تھا۔ وہ ہر ایک کی عزّت کرتے تھے۔ اور علمی استفادے کے لئے ہر اُستاد سے ملتے تھے۔ سوائے پڑھنے لکھنے کے انہیں کسی چیز سے دلچسپی نہیں تھی۔ لیکچروں کے بعد وہ لائبریری میں نظر آتے اور شام کو کتب فروشوں کی دوکانوں میں جاتے اور نئی سے نئی کتابوں کی خبر رکھتے۔ کباڑیوں کے یہاں بھی پہنچتے اور آ کر یہ بتاتے کہ فلاں جگہ فلاں فلاں کتابیں موجود ہیں۔

میرے ایسے اُردو ادب کے طالب علم کے لئے، جس کا اوڑھنا بچھونا ادبی کتابیں تھیں، احراز الحسن ایک سہارا بن گئے۔ وقت کے ساتھ ساتھ شرمیلا پن تو بہر صورت باقی رہا لیکن اتوار کے دن صبح کو گھر پر آنے لگے اور باتیں ادب اور ادبی کتابوں کی کرنے لگے۔

ایم۔اے کرنے کے بعد ایک دن پی۔ایچ۔ ڈی کرنے کی خواہش کا اظہار کیا موضوعات میں نے تجویز کر دیئے۔ سرشار کا مطالعہ انہیں پسند آیا۔ اس کو منظور کروانے کے لئے درخواست بھی دے دی۔ لیکن یہ موضوع منظور

نہ ہو سکا۔ اُن کے ایک استاد یہ نہیں چاہتے تھے کہ وہ پی ایچ ڈی کریں وہ حضرت دُور بیں بہت تھے۔ اور ان کو منصوبہ بندی میں کمال حاصل تھا اور یہ منصوبہ بندی اپنے لئے اور اپنے خاص منظورِ نظر لوگوں کے لئے کرتے تھے۔

اس صورت حال نے احراز الحسن کو بد دل کر دیا۔ اور وہ لکھنؤ واپس چلے گئے۔ ابھی تک وہ ہندوستانی نیشنل تھے۔ اس لئے انہیں واپس جانے میں کوئی دشواری نہیں ہوئی۔ تین چار سال وہ لکھنؤ میں رہے۔ وہاں پی۔ ایچ۔ ڈی میں داخلہ لیا۔ پروفیسر سیّد احتشام حسین صاحب کی نگرانی میں انہوں نے سرشار پر کام کیا۔ اور ایک دن انہوں نے یہ خوش خبری سُنائی کہ لکھنؤ یونیورسٹی نے انہیں پی۔ ایچ۔ ڈی کی ڈگری دے دی ہے۔

مجھے یہ خبر سن کر بے حد مسرّت ہوئی۔

لکھنؤ کے تین چار سالہ قیام میں وہ اکثر لاہور آتے۔ اپنے عزیزوں کے پاس ٹھہرتے۔ میرے پاس بھی خاصا وقت گذارتے، اور لکھنؤ اور علی گڑھ کی زندگی اور وہاں کے ادبی ماحول سے مجھے باخبر رکھتے۔ ایک ایک لکھنے والے کی خبر دیتے۔ کون کیا کام کر رہا ہے، اس کی تفصیل سُناتے۔ اس زمانے میں احراز کی وجہ سے مجھے کبھی یہ احساس نہیں ہوا کہ میں لکھنؤ اور علی گڑھ سے دُور ہوں اور وہاں کے ادبی ماحول سے کٹا ہوا ہوں۔

میرے لئے کتابیں تو خیر لاتے ہی تھے۔ لیکن پان، عطر اور چنبیلی کا تیل بھی لاتے تھے۔ اس لئے کہ انہیں معلوم تھا کہ مجھے لکھنؤ کی ان چیزوں سے دلچسپی ہے۔ ایک دو دفعہ تو دسہری اور سفیدہ آم بھی لائے۔ اس زمانے میں دسہری لاہور میں نہیں ملتا تھا۔ انہیں معلوم تھا کہ مجھے ملیح آبادی دسہری اور سفیدہ مرغوب ہے۔ اس لئے انہوں نے آم تک لانے کی تکلیف اٹھائی۔ ایک عزیز شاگرد کی حیثیت سے وہ ہر لحاظ سے میرا خیال رکھتے تھے۔

ایک دفعہ ایسا ہوا کہ میں لکھنؤ گیا۔ غالباً ۵۸ء یا ۶۰ء کی بات ہے

احراز اس وقت لکھنؤ میں تھے۔ احتشام صاحب سے انہیں معلوم ہو گیا کہ میں اگست کے مہینے میں لکھنؤ پہنچوں گا۔ میں امین آباد کے پرنس ہوٹل میں ٹھہر گیا۔ احراز وہاں مجھ سے ملنے آئے۔ مجھے یونیورسٹی لے گئے۔ نئے ادیبوں اور اسکالروں سے ملاقاتیں کروائیں۔ پُرانے دوستوں اور ادیبوں سے میں ملنے گیا تو وہ میرے ساتھ رہے۔ غرض انہوں نے بڑی خدمت کی۔ اُن کے ساتھ لکھنؤ میں میرا وقت بہت اچھا گذرا۔

ایک دن صبح کو آئے۔ اور کئی ہزار روپے مجھے دیئے۔ مجھے روپے کی ضرورت نہیں تھی۔ کیونکہ میں دہلی ہوتا ہوا لکھنؤ پہنچا تھا اور ڈاکٹر خورشید احمد فارق صدر شعبۂ عربی دہلی یونیورسٹی سے جو رقم میں نے لی تھی وہ میرے اخراجاتِ سفر کے لئے کافی تھی۔ میں نے احراز کو منع کیا اور کہا کہ مجھے ضرورت نہیں ہے۔ لیکن وہ نہیں مانے ضد کر کے یہ رقم مجھے دی اور میں نے اس وعدے کے ساتھ یہ رقم لے لی کہ جب وہ لاہور آئیں گے۔ تو یہ رقم مجھ سے لیں گے۔ اس رقم نے مجھے لکھنؤ میں امیر بنا دیا۔ خدا جانے کیا کیا کچھ میں نے خریدا۔ دو تین مہینے بعد جب وہ لاہور آئے تو میں نے زبردستی یہ رقم انہیں واپس کی۔ واپس نہیں لیتے تھے۔ کہنے لگے۔ مجھے ابھی ضرورت نہیں ہے۔ جب ضرورت ہوگی لے لوں گا۔ لیکن میں نے کہا کہ ضرورت نہیں ہے تو بنک میں جمع کیجئے۔ کام آئیں گے۔ خیر بڑی مشکل سے تیار ہوئے اور میری بات مانی۔!

احراز بڑے ہی مہذب اور شائستہ انسان تھے۔ میں نے انہیں کبھی اونچی آواز میں باتیں کرتے ہوئے نہیں دیکھا۔ وہ ہمیشہ دھیمے لہجے میں بات کرتے تھے۔ اپنے سے بڑوں کی عزت کرتے تھے۔ اساتذہ کا احترام ان کا ایمان تھا۔ بعض احباب سے اُن کی بے تکلفی ضرور تھی لیکن وہ ان سے بھی لئے دیئے رہتے تھے۔ مذاق کرنا مضحکہ اُڑانا اور پھبتی کسنا انہیں نہیں

آتا تھا۔ وہ تو شائستگی کا ایک مجسمہ تھے۔ اس شائستگی اور تہذیب نے ان کے لہجے میں بڑی شیرینی پیدا کر دی تھی۔ ٹھہر ٹھہر کر باتیں کرتے تھے۔
اُن کی ان باتوں میں بڑی لطافت اور نفاست ہوتی تھی۔ لکھنوی تہذیب کی لطافت اور نفاست نے ان کی شخصیت میں رس گھول دیا تھا۔ باتیں کرتے تو ان کے منہ سے پھول جھڑتے تھے۔

اُن کے طالب علم اسی لئے تو ان کے دیوانے تھے۔ شوق سے ان کے لیکچر سُنتے تھے اور اُن کی باتوں سے مستفید اور لُطف اندوز ہوتے تھے۔
اسلامیہ کالج سے بی اے پاس کر کے خاصی تعداد میں طالب علم اورینٹل کالج آتے تھے۔ اور ایم۔ اے میں داخلہ لیتے تھے۔ ان میں سے بیشتر احراز کے شاگرد ہوتے تھے۔ یہ لوگ ہمیشہ ان کی تعریفیں کرتے اور ان کی شائستگی شفقت اور محبت کے گُن گاتے تھے۔ یہ شائستگی شفقت اور محبت اُنہیں ماحول اور معاشرے سے ملی تھی۔ اور اس میں میرے اور ان کے اُستاد گرامی پروفیسر سید احتشام حسین صاحب کی عظیم شخصیت کا بڑا ہاتھ تھا۔

احتشام حسین صاحب عجیب و غریب شخصیت کے مالک تھے۔ میں نے ان کی شخصیت میں ایک فرشتے کو دیکھا۔ انہوں نے اپنے شاگردوں کی ایک کھیپ پیدا کی جو فرشتوں کی خصوصیات رکھتے تھے۔ جو صرف خیر ہی خیر تھے۔ محبت ہی محبت تھے یہ شاگرد زندگی کے مختلف شعبوں میں گئے اور انہوں نے ہر جگہ انسانیت شرافت اور محبت کا ماحول پیدا کیا جو لوگ کالجوں اور یونیورسٹیوں میں گئے انہوں نے وہاں اپنے طالب علموں پر جادو کیا اور اپنے اپنے اداروں میں ایسے شاگرد پیدا کئے جو انسانیت محبت نیکی اور شرافت کو دور دور لے گئے۔

احراز بھی ان میں سے ایک تھے۔ انہوں نے بھی اپنے ادارے اسلامیہ کالج سول لائنز لاہور میں اِن شمعوں کو فروزاں رکھا اور ایسے طالب علم

تیار کر کے نکالے جو نیکی اور شرافت کے پیکر تھے۔ یہ ایک استاد کی سب سے بڑی دولت ہوتی ہے اور احراز اپنی زندگی میں اس دولت سے مالا مال ہوئے۔

اور یہ سب احتشام صاحب کا فیض تھا۔

یہ بھی احتشام صاحب ہی کا فیض تھا کہ احراز نے لکھنے پڑھنے کو اپنا اوڑھنا بچھونا بنایا۔ اور زندگی بھر خاموشی کے ساتھ اُردو ادب کے مختلف پہلوؤں پر تحقیقی اور تنقیدی کام کرتے رہے۔ انہوں نے کلاسیکی ادب سے بھی دلچسپی لی اور جدید ادب کا بھی بڑی باقاعدگی سے مطالعہ کیا۔ سرشار تو ان کی تحقیق کا خاص موضوع تھا۔ اور جب ان کا تحقیقی مقالہ شائع ہوگا تو سرشار کے مطالعے میں اہم اضافہ سمجھا جائے گا۔ اس کے علاوہ فورٹ ولیم کالج پر بھی انہوں نے کام کیا۔ اخوان الصفا کو مرتب کیا اور اس پر مقدمہ لکھا۔ اودھ اور خصوصاً واجد علی شاہ کے علمی ادبی ماحول پر مقالات لکھے۔ اختر شاہنشاہی پر تحقیقی کام کیا اور جدید اُردو ادب کے مختلف پہلوؤں پر بہت سے مقالات لکھے جن میں سے بیشتر مختلف علمی ادبی رسائل میں شائع ہو چکے ہیں۔ یہ مقالات یک جا ہو کر کتابی صورت میں سامنے آئیں گے تو ان کی اہمیت کا صحیح اندازہ پڑھنے والے کو ہوگا۔

احراز اپنی زندگی میں ایسا نہ کر سکے۔ وہ اس معاملے میں کچھ بے نیاز سے آدمی تھے۔ ان کے عزیزوں اور دوستوں کو اس کام کی طرف توجہ کرنی چاہیئے۔ ان کو خراج تحسین پیش کرنے اور اُن کی روح کو خوش کرنے کا اس سے بہتر کوئی اور طریقہ نہیں ہو سکتا۔

احراز الحسن کو ادب کے مختلف پہلوؤں سے تو خیر دلچسپی تھی ہی، لیکن وہ ادیبوں سے بھی گہری دلچسپی لیتے تھے۔ بڑے مہمان نواز واقع ہوئے تھے۔ ادیبوں کو اپنے ہاں جمع کرتے، دعوتیں کرتے محفلیں سجاتے۔ اچھے اچھے

کھانے کھلاتے۔ ان کی بیگم میمونہ انصاری بھی اس میں برابر کی شریک ہوتیں۔ انتقال سے چند ماہ قبل تو انھوں نے کئی دعوتیں کیں اور لاہور کے بیشتر ادیبوں کو جمع کیا مشہور افسانہ نگار رام لعل کے اعزاز میں جو دعوت انھوں نے کی اس میں تو تقریباً پچاس ادیب ضرور موجود تھے۔ اچھا خاصہ ہنگامہ تھا۔

میں تو اس دن ذرا جلدی معذرت کر کے واپس آ گیا۔ لیکن معلوم یہ ہوا کہ کھانے کے بعد دیر تک شعروادب کی یہ محفل جاری رہی، اور احراز اس محفل سے لطف اندوز ہوتے رہے۔

اس کے بعد ان سے ملاقات نہ ہو سکی۔ انتقال سے چند روز قبل وہ اورینٹل کالج میں آئے۔ میں سمسٹر کا امتحان لے رہا تھا۔ ان کے ایک پرانے شاگرد نے مجھے یہ اطلاع دی کہ ڈاکٹر احراز آئے ہیں، نیچے بیٹھے ہیں، ملنا چاہتے ہیں۔

میں نے اس طالب علم سے یہ پیغام بھجوایا کہ اوپر آ جائیں۔ امتحان ہوتا رہے گا۔ یہیں باہر نکل کر باتیں کریں گے۔

میں ان کا انتظار کرتا رہا۔ لیکن وہ اوپر نہیں آئے، دوسرے اساتذہ سے باتیں کر کے چلے گئے۔ مجھے امتحان کے کام میں دیر ہو گئی اور ان سے ملاقات نہ ہو سکی۔

دراصل وہ اس دن آخری بار ملنے کے لئے آئے تھے۔ لیکن صرف اس خیال سے ملنے کے لئے اوپر نہیں آئے کہ امتحان ہو رہا ہے۔ مجھے الجھن اور طالب علموں کو پریشانی ہوگی۔ ان باتوں کا وہ بہت خیال رکھتے تھے۔ یہ ان کا مزاج تھا۔ دو تین دن کے بعد صبح کے وقت میں دفتر میں بیٹھا تھا کہ فون کی گھنٹی بجی میں نے فون اٹھایا۔ کسی نے یہ وحشت اثر خبر سنائی کہ احراز کا انتقال ہو گیا۔

میرے پیروں تلے سے زمین نکل گئی۔ یقین نہیں آیا۔ خیال ہوا کہ کسی نے شرارت سے یہ خبر دی ہے۔ لڑکوں کو اسلامیہ کالج دوڑایا۔ چند منٹ کے بعد وہ

وہ واپس آئے خبر کی تصدیق ہو گئی۔ میں سیدھا ان کے گھر پہنچا۔ ایک کہرام مچا ہوا تھا۔ برداشت نہ کر سکا۔ ایک کونے میں بیٹھا رہا۔ لوگ ان کے ہسپتال جانے اور دنیا سے رخصت ہونے کی تفصیل سنا رہے تھے۔ کوئی عزیزوں سے ان کے برتاؤ کے واقعات بیان کر رہا تھا۔ میں چپ چاپ سنتا رہا اور میرا دل آنسو بہاتا رہا۔

اور آج بھی کہ احراز کو بچھڑے ہوئے کئی سال گذر چکے ہیں، میرا دل آنسو بہا رہا ہے۔ اور میں یہ سوچ رہا ہوں کہ ایک اچھا شاگرد، ایک اعلےٰ درجے کا انسان ایک بلند مرتبہ استاد، ایک مہذب، شائستہ اور مخلص دوست، ایک اعلےٰ پائے کا ادیب، محقق اور نقاد عین جوانی کے عالم میں اس طرح چپ چپاتے ہم سے کیوں ہمیشہ ہمیشہ کے لئے رخصت ہو گیا۔ جب بھی احراز کا خیال آتا ہے تو تھوڑے سے تصرف کے ساتھ غالب کا یہ شعر میری زبان پر آجاتا ہے۔

ہاں اے فلک پیر جواں تھا ابھی احراز
کیا تیرا بگڑتا جو نہ مرتا کوئی دن اور

حکیم حافظ جلیل احمدؒ

حکیم حافظ جلیل احمدؒ لاہور کے نامور طبیب تھے۔ وہ خاصے عرصے تک لاہور طبیہ کالج کے پرنسپل رہے۔ وہ باقاعدگی سے مطب بھی کرتے تھے، فلیمنگ روڈ پر اُن کا مطب مرجع خلائق تھا۔ ہر طبقے کے لوگ، امراء، رؤسا اور عوام الناس اُن کی طبی بصیرت سے استفادہ کرتے تھے۔ اللہ تعالےٰ نے اُن کے ہاتھ میں ایسی شفا دی تھی کہ ہر شخص اُن کے معمولی نسخوں سے صحت یاب ہو جاتا تھا۔ وہ قدیم روایات کے علم بردار اور اسلامیان پاکستان و ہند کی بلند اخلاقی اقدار کا ایک نہایت ہی دلکش و دل آویز نمونہ تھے، اور اُن کو دیکھ کر دہلی اور لکھنؤ کے حاذق اطباء کی یاد تازہ ہو جاتی تھی۔

آج سے تقریباً چالیس سال قبل اُن سے میری ملاقات ہوئی تھی۔ میں اُن دنوں لاہور میں نووارد تھا۔ قیام پاکستان کے بعد لُٹ پٹ کر اور قلزم دریائے خوں کو عبور کر کے اس شہر نگاراں میں داخل ہوا تھا۔ میری طبیعت اُس زمانے میں خراب رہتی تھی۔ لکھنؤ اور دِلّی میں زندگی کے دن گذارے تھے۔ اس لئے یونانی علاج کی عظمت و برتری کا قائل تھا۔ چنانچہ یہ خیال آیا کہ لاہور میں کسی طبیب سے مشورہ کرنا چاہیئے۔

میں نے ایک دن اس سلسلے میں اپنے پُرانے دوست حکیم رشید احمدؒ ندوی صاحب سے مشورہ کیا۔ انہوں نے یہ رائے دی کہ مجھے حکیم حافظ جلیل احمدؒ صاحب پرنسپل طبیہ کالج کو نبض دکھانی چاہیئے۔ وہ اعلےٰ پائے کے طبیب ہیں اُن کا علم بہت وسیع ہے، اور اُن کے ہاتھ میں اللہ تعالےٰ نے شفا بھی دی ہے۔ پڑھنے لکھنے والوں اور استادوں کی عزّت بھی کرتے ہیں اور اُن کا خاص طور پر خیال رکھتے ہیں۔

حکیم جلیل احمدؒ صاحب رشید صاحب کے دوست تھے۔ چنانچہ وہ مجھے ایک دن حکیم صاحب کے پاس لے گئے۔ فلیمنگ روڈ کی ایک پُرانی عمارت کے تنگ و تاریک زینے میں سے گذر کر ہم لوگ اس عمارت کی دوسری منزل میں پہنچے تو دیکھا کہ ایک کمرے میں حکیم صاحب تخت پر گاؤتکیے سے ٹیک لگائے بیٹھے ہیں۔ مریضوں کا مجمع ہے، اور حکیم صاحب نہایت خندہ پیشانی کے ساتھ مریضوں کو دیکھنے میں مصروف ہیں۔

ہم لوگ مطب میں داخل ہوئے تو حکیم صاحب نے اپنی روایتی خندہ پیشانی سے ہم لوگوں کو خوش آمدید کہا۔ اپنی جگہ سے اُٹھ کھڑے ہوئے۔ پہلے ہمیں اپنے پاس بٹھایا، پھر خود بیٹھے۔ خاصی دیر تک حال احوال پوچھتے رہے۔ حکیم رشید احمد صاحب نے میرا تعارف کرایا اور کہا کہ "عبادت صاحب میرے عزیز دوست ہیں۔ حال ہی میں دلّی سے لاہور آئے ہیں۔ اورینٹل کالج میں اُردو زبان و ادب کے استاد ہیں، لکھنے پڑھنے والے آدمی ہیں۔ ادیب اور نقاد ہیں۔ ان کی کئی کتابیں شائع ہو چکی ہیں۔ میں انہیں بہت عزیز رکھتا ہوں۔ اِن کی طبیعت آج کل خراب رہتی ہے۔ دِلّی کے فسادات میں انہوں نے بڑی تکلیفیں اُٹھائی ہیں۔ بڑے ہی دل دوز مناظر دیکھے ہیں۔ اُن کی طبیعت پر اِس کا اثر ہے۔ میں نبض دکھانے کے انہیں آپ کے پاس لایا ہوں۔"

یہ سب کچھ سُن کر حکیم صاحب بولے "سب کچھ ٹھیک ہو جائے گا۔ بالکل فکر نہ کیجیئے۔ میں نبض بھی دیکھ لوں گا۔ نُسخہ بھی لکھ دوں گا۔"

میں نے یہ دیکھ کر کہا" ہم لوگ مُخل ہوئے۔ جو مریض باقی ہیں، آپ پہلے انہیں دیکھ لیجیئے۔ میں بھی آج ایک مریض کی حیثیت سے آپ کے مطب میں حاضر ہوا ہوں۔ سب سے آخر میں جب میری باری آئے گی تو نبض دکھاؤں گا۔"

حکیم صاحب نے میری بات مان تو لی لیکن کہا کہ" آپ تو میرے مہمان ہیں۔ چند منٹ میں مریضوں کو فارغ کر کے ذرا اطمینان سے آپ سے باتیں کروں گا۔"

یہ کہہ کر اُنھوں نے آواز دی" ننھے"!

حکیم صاحب کی آواز سُن کر ننھے میاں باہر آئے۔

حکیم صاحب نے اُن سے کہا" ننھے میاں! ڈاکٹر عبادت صاحب اور حکیم رشید صاحب آئے ہیں۔ چائے کے لئے کہہ دو۔ ہم لوگ اندر کمرے میں چائے پیئں گے"۔

یہ سُن کر حکیم صاحب کے چھوٹے بیٹے ننھے میاں اندر گئے، اور تھوڑی دیر میں آکر کہا" چائے لگا دی گئی ہے"۔

میں نے کہا" آپ نے چائے کے لئے زحمت کی۔ میں تو آج کل چائے نہیں پیتا۔ اور پھر آج تو میں مریض کی حیثیت سے حاضر ہوا ہوں"۔

حکیم صاحب کہنے لگے" کوئی بات نہیں۔ چائے تو محفل گرم کرنے اور مِل بیٹھنے کا بہانہ ہے۔ ویسے آپ چائے ضرور پیا کیجیئے۔ آپ کو بالکل نقصان نہیں کرے گی۔ ایک پیالی پینے سے کوئی نقصان نہیں ہوگا۔ طبّی اعتبار سے دیکھا جائے تو یہ بعض حالات میں مفید ہے۔ یہ بات میں ایک طبیب کی حیثیت سے کہہ رہا ہوں"۔

اُن کی یہ باتیں محبت کے رس میں ایسی ڈوبی ہوئی تھیں کہ میں اُن سے لُطف اندوز ہونے لگا۔ دل میں یہ خواہش بیدار ہوئی کہ ایسے خوش گوار ماحول میں چائے ضرور پینی چاہیئے۔ حکیم صاحب کا ایسا محبت والا انسان اگر زہر بھی پلائے تو وہ امرت ہے۔

تھوڑی دیر میں حکیم صاحب مریضوں سے فارغ ہوگئے۔ اس عرصے میں

ننھے میاں نے چائے دوسرے کمرے میں رکھوادی۔ انہوں نے آکر یہ اطلاع دی
تو حکیم صاحب ہم لوگوں کو برابر کے کمرے میں لے گئے۔ وہاں ہم نے چائے
پی، اور ان کے ساتھ چند ایسے لمحے گذارے جو روح کو بالیدہ کر دیتے ہیں۔

اس کے بعد حکیم صاحب نے میری نبض دیکھی۔ حال پوچھا، نسخہ لکھا، اور
اپنے عطار محمد علی کو بلا کر کہا کہ نسخے باندھ کر یہیں پہنچادو۔ تھوڑی دیر میں دواؤں
کی پڑیاں آگئیں۔ حکیم صاحب نے اِن کی ترکیب استعمال بتائی۔ اس کے بعد، ہم
نے اُن سے اجازت لی۔ وہ ہمیں باہر دروازے تک رخصت کرنے کے لئے
آئے اور یہ کہہ کر ہمیں رخصت کیا کہ "آپ سے مل کر خوشی ہوئی۔ انشاءاللہ آئندہ
بھی ملاقات ہوتی رہے گی"۔

اور میں راستے میں یہ سوچتا رہا کہ یہ کیسے حکیم صاحب ہیں کہ مریض کا علاج
بھی کرتے ہیں، اصرار کر کے چائے بھی پلاتے ہیں، اور خلوص و محبت سے بھری
ہوئی باتیں بھی کرتے ہیں، اور جب وہ واپس جانے لگتا ہے تو دروازے
تک اُس کو رخصت کرنے کے لئے بھی آتے ہیں۔

حکیم جلیل احمد صاحب اخلاص کا پیکر تھے، اخلاق کا مجسمہ تھے۔ اُن کے اس
طرزِ عمل میں تکلف نام کو نہیں تھا۔ وہ ہر ایک سے نہایت خندہ پیشانی سے ملتے
تھے، اور لکھنے پڑھنے والوں کے تو شیدائی تھے۔ دوستوں کے ساتھ مل کر تو
وہ بے انتہا خوشی کا اظہار کرتے تھے۔ یوں محسوس ہوتا تھا جیسے وہ اُن کے
سامنے بچھے جا رہے ہیں، اور اُن کی کلی کلی کھلی جا رہی ہے۔ میری اُن سے بے
شمار ملاقاتیں ہوئیں، کبھی مطب میں، تو کبھی گھر پر، لیکن اُن کے اس رویے میں
کبھی کوئی فرق نہیں دیکھا۔ وہ کبھی ناراض نہیں ہوتے تھے۔ اُنہیں کبھی غصہ نہیں
آتا تھا۔ ایک لطیف سی مسکراہٹ ہر وقت ان کے چہرے پر کھیلتی رہتی تھی۔
مریضوں کے ساتھ بھی وہ خندہ پیشانی سے پیش آتے تھے۔ بعض مریض بعض
اوقات بڑی بے تکی باتیں کرتے ہیں۔ عجیب عجیب باتیں پوچھتے ہیں۔ اِن بے تکی

باتوں پر معالج کو غصّہ بھی آجاتا ہے۔ کبھی کوئی ایسی بات ہو بھی جاتی تھی تو وہ مریض کو کچھ زیادہ ہی خندہ پیشانی سے سمجھاتے تھے۔ بگڑنا اور ناراض ہونا تو ان کے مزاج ہی میں نہیں تھا۔

حکیم صاحب کو ادب و شعر کا چسکا تھا۔ اپنی نجی صحبتوں میں وہ ادب کے مسائل پر بحث بھی کرتے تھے۔ بعض لوگوں سے اختلاف کی نوبت بھی آجاتی تھی لیکن حکیم صاحب اختلاف کی بات بھی کچھ اس طرح کرتے تھے کہ وہ شہد و شکر میں ڈوبی ہوئی معلوم ہوتی تھی۔ خاطر تواضع میں وہ اپنا ثانی نہیں رکھتے تھے۔ خوش خُلقی میں اُن کا جواب نہیں تھا۔ کوئی شخص اُن کے پاس آئے تو ناممکن تھا کہ وہ اُٹھ کر اُس کا استقبال نہ کریں، اور وہ جب رخصت ہونے لگے تو اس کے باہر دروازے تک اس کو رخصت کرنے کے لئے نہ آئیں۔ انہوں نے کبھی کسی کو پہلے سلام کرنے کا موقع نہیں دیا۔ اکثر وہ اپنی جائے قیام سے تانگے میں مطب جاتے تھے راستے میں اکثر اُن کا تانگہ نظر آجاتا تھا، لیکن حکیم صاحب پہلے ہی سلام کے لئے ہاتھ اُٹھاتے تھے۔ مجھے تو ہمیشہ یہ حسرت ہی رہی کہ مَیں انہیں دیکھ کر پہلے سلام کے لئے ہاتھ اُٹھاؤں۔

جلیل احمدؔ صاحب ایک بہت بڑے عالم، طب یونانی کے بہت بڑے ماہر اور طبیب حاذق تھے۔ دینی مسائل، فلسفہ، اخلاق، مابعدالطبیعات، نفسیات اور منطق پر اُن کی گفتگو سُننے سے تعلق رکھتی تھی۔ کبھی کوئی علمی مسئلہ زیر بحث آجاتا تھا تو حکیم صاحب اُس کے مختلف پہلوؤں پر کچھ اس طرح روشنی ڈالتے تھے کہ سب کچھ آئینہ ہو کر سامنے آجاتا تھا۔ انہوں نے عربی اور فارسی زبانوں کے ذریعے سے یہ علوم حاصل کئے تھے، اس لئے اُن کے سوچنے کا انداز اور غور کرنے کا طریق کار قدیم ضرور تھا لیکن وہ تنگ نظر نہیں تھے۔ جدید معلومات سے اُنہیں گہری دلچسپی تھی، اور وہ نئے نئے علوم سے واقفیت حاصل کرنے کی کوشش کرتے تھے۔ سائنس کی نئی سے نئی تحقیقات تک سے انہوں نے دلچسپی کا اظہار

تبصرے میں ایک فقرہ یہ بھی تھا کہ "حکیم جلیل احمدؒ صاحب پاکستان میں علم طب کے سب سے بڑے ماہر ہیں"۔ اگرچہ یہ ایک حقیقت تھی، اور میں نے بہت سوچ سمجھ کر یہ فقرہ لکھا تھا۔ لیکن چند روز کے بعد جب حکیم صاحب سے میری ملاقات ہوئی تو انہوں نے اپنے مخصوص نرم لہجے میں فرمایا کہ "یہ فقرہ لکھ کر آپ نے مجھے بڑی آزمائش میں ڈال دیا ہے۔ پاکستان میں تو اس وقت بھی علم طب کے بڑے بڑے ماہر موجود ہیں۔ اُن کے سامنے میری کیا حیثیت ہے۔ میں تو ابھی تک طفل مکتب ہوں"۔

لیکن میں نے کہا "حکیم صاحب قبلہ! میں نے یہ فقرہ بہت سوچ سمجھ کر لکھا ہے۔ مجھے اپنی رائے پر قائم رہنے کا حق ہے، اور میں اپنی اس رائے کو بدلنے کے لئے تیار نہیں ہوں"۔

حکیم صاحب میری یہ بات سُن کر خاموش رہے۔ اُن کے مزاج میں عاجزی اور انکساری بہت تھی۔ وہ ہمیشہ اپنے آپ کو ایک عالم سے زیادہ ایک طالب علم سمجھتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ اپنی تعریف سے گھبراتے تھے اور یہی اُن کی عظمت کی نشانی تھی۔

بہرحال تذکرۂ جلیل پر میرا یہ تبصرہ حکیم صاحب بغیر ترمیم کے چھپوانے کے لئے تیار ہوگئے، اور میرے اصرار پر انہوں نے اپنی اس کتاب کے آخر میں اس کو شامل بھی کر دیا۔ مجھے اُن کے اس فیصلے سے خوشی ہوئی۔

علم طب میں حکیم صاحب کو جو بصیرت حاصل تھی، اُس کا اعتراف بیرونِ پاکستان، خاص طور پر ہندوستان کے بڑے بڑے طبیب بھی کرتے تھے۔ حکیم صاحب کی حیات میں میرے جاننے والے ایک صاحب لاہور سے لکھنؤ گئے، وہاں انہیں کچھ تکلیف ہوگئی۔ انہوں نے لکھنؤ کے ایک بہت بڑے حاذق طبیب حکیم عبدالمعید صاحب کو دکھایا۔ اُن کے علاج سے وہ تکلیف دُور ہوگئی۔ جب وہ لکھنؤ سے لاہور واپس آنے لگے تو پھر حکیم معید صاحب کی

کیا۔ آئن سٹائین کے نظریہ اضافیت اور جوہری توانائی کے موضوعات پر میرے سامنے اُنہوں نے ایسی گفتگو کی جس کو سُن کر میں حیران رہ گیا۔ نئے سائنسی موضوعات پر وہ اس دور کے مشہور سائنس دانوں اور طب کے ماہروں سے خط و کتابت بھی کرتے تھے۔ عربی اور فارسی پر تو اُنہیں عبور حاصل تھا لیکن انگریزی بھی خوب جانتے تھے۔ اِن تینوں زبانوں میں مختلف علوم کے مطالعے کا سلسلہ انہوں نے آخری عمر تک جاری رکھا۔

اور علم طب میں تو وہ ڈوبے ہوئے تھے۔ اس علم میں اُن کا مطالعہ بہت وسیع تھا۔ علم طب کے بڑے بڑے ماہروں کی تحریریں اُنہیں ازبر تھیں۔ انہوں نے اِن کی تصانیف کا مطالعہ بڑی محنت سے کیا تھا۔ اس کا ثبوت اُن کی کتاب "تذکرہ جلیل" ہے۔ اس کتاب میں اُنہوں نے علم طب کے تقریباً تمام ماہرین کے اقوال جمع کئے ہیں اور اُن پر محاکمہ بھی کیا ہے۔ اس کتاب سے اُن کے علم اور بصیرت دونوں کی وضاحت ہوتی ہے۔ لیکن اس کے باوجود انہیں اپنے ماہر طب ہونے کا احساس نہیں تھا، اور یہی اُن کی بڑائی کی دلیل ہے۔

"تذکرہ جلیل" جب شائع ہوئی تو اُنہوں نے ازراہ نوازش بڑی محبت سے اس کا ایک نسخہ مجھے بھی عنایت فرمایا۔

یہ کتاب علم طب کی اچھی خاصی انسائیکلو پیڈیا تھی۔ کیونکہ اس میں حکیم صاحب نے بقراط، جالینوس، طبری، رازی، حسن بن نوح، مجوسی، شیخ الرئیس، ابن ہبل، سمرقندی، مُلّا نفیس، انطاکی، سویدی، ابوسعید مغربی اور اِن کے علاوہ تمام اکابر اطبائے متقدمین کے خیالات، اُن کے مجربات، اور علم طب کے سلسلے میں پیش کئے ہوئے اُن کے رموز و نکات کو یکجا کر دیا تھا۔ اور اس سے یہ حقیقت واضح ہوتی تھی کہ حکیم صاحب تاریخ طب پر گہری نظر رکھتے ہیں۔

علم طب پر اُن کی اِس کتاب کا میں نے بڑے شوق سے مطالعہ کیا، اور اپنے تاثرات ایک تبصرے کی صورت میں لکھ کر حکیم صاحب کو بھیج دیئے۔ اس

تبصرے میں ایک فقرہ یہ بھی تھا کہ "حکیم جلیل احمدؒ صاحب پاکستان میں علم طب کے سب سے بڑے ماہر ہیں"۔ اگرچہ یہ ایک حقیقت تھی، اور میں نے بہت سوچ سمجھ کر یہ فقرہ لکھا تھا۔ لیکن چند روز کے بعد جب حکیم صاحب سے میری ملاقات ہوئی تو انہوں نے اپنے مخصوص نرم لہجے میں فرمایا کہ "یہ فقرہ لکھ کر آپ نے مجھے بڑی آزمائش میں ڈال دیا ہے۔ پاکستان میں تو اس وقت بھی علم طب کے بڑے بڑے ماہر موجود ہیں۔ اُن کے سامنے میری کیا حیثیت ہے۔ میں تو ابھی تک طفل مکتب ہوں"۔

لیکن میں نے کہا "حکیم صاحب قبلہ! میں نے یہ فقرہ بہت سوچ سمجھ کر لکھا ہے۔ مجھے اپنی رائے پر قائم رہنے کا حق ہے، اور میں اپنی اس رائے کو بدلنے کے لئے تیار نہیں ہوں"۔

حکیم صاحب میری یہ بات سُن کر خاموش رہے۔ اُن کے مزاج میں عاجزی اور انکساری بہت تھی۔ وہ ہمیشہ اپنے آپ کو ایک عالم سے زیادہ ایک طالب علم سمجھتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ اپنی تعریف سے گھبراتے تھے اور یہی اُن کی عظمت کی نشانی تھی۔

بہرحال تذکرۂ جلیل پر میرا یہ تبصرہ حکیم صاحب بغیر ترمیم کے چھپوانے کے لئے تیار ہو گئے، اور میرے اصرار پر انہوں نے اپنی اس کتاب کے آخر میں اس کو شامل بھی کر دیا۔ مجھے اُن کے اس فیصلے سے خوشی ہوئی۔

علم طب میں حکیم صاحب کو جو بصیرت حاصل تھی، اُس کا اعتراف بیرونِ پاکستان، خاص طور پر ہندوستان کے بڑے بڑے طبیب بھی کرتے تھے۔

حکیم صاحب کی حیات میں میرے جاننے والے ایک صاحب لاہور سے لکھنؤ گئے، وہاں انہیں کچھ تکلیف ہو گئی۔ انہوں نے لکھنؤ کے ایک بہت بڑے حاذق طبیب حکیم عبدالمعید صاحب کو دکھایا۔ اُن کے علاج سے وہ تکلیف دُور ہو گئی۔ جب وہ لکھنؤ سے لاہور واپس آنے لگے تو پھر حکیم معید صاحب کی

خدمت میں حاضر ہوئے اور کہا کہ "میں اب واپس لاہور جا رہا ہوں۔ وہاں اگر پھر خدانخواستہ تکلیف ہو جائے تو کیا کروں؟"

حکیم عبدالمعید صاحب نے فرمایا "وہاں ایک بہت بڑے طبیب حکیم حافظ جلیل احمدؒ صاحب ہیں۔ اُن سے مشورہ کیجئے۔ انشاءاللہ ان کے علاج سے تمام تکلیفیں رفع ہو جائیں گی۔"

چنانچہ وہ لاہور آکر حکیم صاحب سے ملے اُن کا علاج کیا، اور اُن کی تمام تکلیفیں دُور ہو گئیں۔

میں حکیم عبدالمعید صاحب کو ایک زمانے سے جانتا تھا۔ وہ بہت بڑے طبیب تھے۔ کسی کی تعریف مشکل ہی سے کرتے تھے۔ لیکن حکیم جلیل صاحب پر اُن کو بھروسہ تھا۔ اسی لئے انہوں نے اُن کی تعریف کی، اور اپنی جگہ معالج کی حیثیت سے اُن کا نام تجویز کیا۔ اور اُن کے اعتماد کو ٹھیس نہیں لگی۔

اللہ تعالےٰ نے حکیم جلیل احمدؒ صاحب کے ہاتھ میں شفا بھی بہت دی تھی۔ معمولی سا نسخہ لکھ دیتے تھے، اور مریض کو اس کے استعمال سے شفا ہو جاتی تھی۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ وہ بلا کے ذہین انسان تھے، اور فوراً مرض کی تہہ تک پہنچ جاتے تھے۔ اس لئے تشخیص میں انہیں کوئی دشواری پیش نہیں آتی تھی۔ معمولی سا نسخہ لکھ دیتے تھے جس کے استعمال سے مریض کو فائدہ ہو جاتا تھا۔

اُردو کے مشہور ادیب محمدؐ حسن عسکری صاحب مرحوم میرے عزیز دوست تھے۔ اینگلو عربک کالج دہلی میں انگریزی کے اُستاد اور میرے رفیق کار تھے۔ تقسیم ہند کے بعد پاکستان آئے تو اسلامیہ کالج کراچی میں انگریزی کے پروفیسر ہو گئے۔ کراچی میں انہیں معدے کی شکایت رہتی تھی۔ غالباً وہاں کی آب و ہوا کا اثر تھا۔ ڈاکٹروں کا علاج کرتے رہتے تھے لیکن کوئی فائدہ نہیں ہوتا تھا۔ موسم گرما کی تعطیلات میں وہ لاہور آجاتے تھے، ایک دن انہوں نے مجھ سے اپنی علالت کا ذکر کیا تو میں نے کہا "آپ میرے ساتھ حکیم جلیل احمدؒ صاحب کے پاس چلئے۔

وہ آپ کی نبض دیکھ کر معمولی سا نسخہ لکھ دیں گے۔ آپ کی تکلیف دُور ہو جائے گی"۔

چنانچہ یہی ہوا۔ میں انہیں حکیم صاحب کے پاس لے گیا۔ اُنھوں نے اُن کا حال سُن کر معمولی سا نُسخہ لکھ دیا۔ چند روز کے استعمال کے بعد عسکری صاحب ملے تو اُنہوں نے کہا "عبادت صاحب! حکیم صاحب کے اس نُسخے نے تو مجھ پر جادو کا اثر کیا ہے۔ میری تمام تکلیفیں دور ہو گئی ہیں، اور میں پوری طرح صحت مند ہوں"۔

پروفیسر سید وقار عظیم صاحب بھی ہمیشہ حکیم صاحب ہی کا علاج کرتے تھے، اور اُن کے علاج سے انہیں ہمیشہ فائدہ ہوتا تھا۔ حکیم حبیب اشعر دہلوی اگرچہ خود اعلےٰ درجے کے طبیب تھے لیکن جب بھی کوئی تکلیف ہوتی تھی تو علاج کے لئے حکیم جلیل احمدؐ صاحب کے پاس جاتے تھے، اور اُن کے نسخے کے استعمال سے اُنہیں فائدہ ہوتا تھا۔ جگر صاحب اُس زمانے میں اکثر ہندوستان سے لاہور آتے رہتے تھے۔ اُن کی صحت ٹھیک نہیں رہتی تھی۔ حکیم جلیل صاحب اُن کا علاج بڑی محبت سے کرتے تھے، اور اُن کے علاج سے جگر صاحب کی صحت ٹھیک ہو جاتی تھی، حکیم صاحب اُن کے لئے خاص طور پر دوائیں بھی تیار کرواتے تھے اور جب وہ ہندوستان واپس جاتے تھے تو ان دواؤں کو اپنے ساتھ لے جاتے تھے۔ یوں تو حکیم جلیل صاحب ہر شخص کا علاج پوری دل سوزی سے کرتے تھے، لیکن ادیبوں اور شاعروں کے علاج پر وہ خصوصی طور پر توجہ کرتے تھے اور اُن کی دوائیں تک اپنی نگرانی میں تیار کرواتے تھے۔

روزنامہ "مشرق" کے ایڈیٹر، اور مشہور صحافی شاعر اور ادیب مکین احسن کلیم صاحب مرحوم کو بھی حکیم صاحب سے بڑی عقیدت تھی۔ وہ اکثر بیمار رہتے تھے۔ شاید اس کی وجہ کام کی زیادتی اور کچھ حالات کی ناسازگاری تھی۔ ڈاکٹروں سے دِل برداشتہ ہو کر وہ ہمیشہ حکیم جلیل صاحب کا علاج کرتے تھے، اور اُن کے علاج

سے مکین صاحب کی طبیعت ٹھیک ہو جاتی تھی۔ مکین صاحب بڑے ذہین اور پڑھے لکھے آدمی تھے۔ اسی لئے حکیم صاحب کے دل میں اُن کی بڑی عزّت تھی۔ وہ اُن کا خاص طور پر خیال رکھتے تھے، اور اُن کا علاج بڑی محبت سے کرتے تھے۔

ادب و شعر سے حکیم صاحب کو گہری دلچسپی تھی اور وہ ادیبوں اور شاعروں کے پرستار تھے۔ ادب کا چسکا تھا۔ کسی زمانے میں شعر بھی کہتے تھے۔ مشاعرے بھی پڑھتے تھے۔ لیکن یہ اُن دنوں کی بات ہے جب اُن کا قیام لکھنؤ اور دلّی میں تھا۔ لاہور میں اُن کی مصروفیات اتنی بڑھ گئی تھیں کہ انہیں اس کام کے لئے وقت کم ملتا تھا۔ پھر بھی احباب کے اصرار پر اپنے شعر سنا دیتے تھے، اور مشاعروں اور ادبی محفلوں میں بھی شریک ہو جاتے تھے۔ خود اپنے مکان پر بھی محفلیں منعقد کرتے تھے۔ اور اُن کا بہترین وقت وہ ہوتا تھا جو ادیبوں اور شاعروں کے ساتھ گذرتا تھا۔ اُن کا ذوق ادب نہایت ستھرا اور نکھرا ہوا تھا۔ شعر فہمی اور ادبی مسائل کو سمجھنے میں وہ اپنا جواب نہیں رکھتے تھے۔ ادبی معاملات پر اظہارِ خیال کرتے ہوئے وہ ایسے ایسے نکتے سُجھاتے اور پہلو پیدا کرتے تھے کہ عقل حیران اور بصیرت دنگ رہ جاتی تھی۔

غرض حکیم جلیل احمدؒ صاحب بڑی خوبیوں کے مالک تھے۔ اُن میں کوئی خامی نہیں تھی۔ ایک ایسا انسان جس میں خوبیاں ہی خوبیاں ہوں اس دورِ پُر آشوب میں بڑی مشکل سے ملتا ہے۔ وہ ایک بہت اچھے انسان، ایک بہت اچھے دوست، ایک بہت اچھے طبیب ایک بہت اچھے شوہر، اور ایک بہت اچھے باپ تھے۔ اُن کی انسان دوستی، اُن کی وضع داری، اُن کی اخلاص مندی، اُن کی ہمدردی اُن کی شفقت اور محبت کے جو ان گنت مناظر میں نے دیکھے ہیں، اُن کو کبھی بھلایا نہیں جا سکتا۔

افسوس ہے کہ حکیم جلیل احمد صاحب   باسٹھ سال کی عمر ہی میں ہم سے بچھڑ گئے، اور اپنے ساتھ اُن تمام خصوصیات کو بھی لے گئے جن سے وہ پہچانے جاتے تھے۔ وہ ایک عظیم تہذیبی وطبّی روایت کی علامت اور حُسنِ اخلاق کی ایک حسین و دلآویز تصویر تھے۔ افسوس ہے کہ یہ روایت بھی اُن کے ساتھ ہی اللہ کو پیاری ہوگئی۔

افتخار عزیز

آج سے تقریباً نصف صدی قبل ایک انگریز مُصنّف ہالبروک جیکسن HOLBROOK JACKSON نے ایک فکر انگیز کتاب "ریڈر ایز آرٹسٹ" READER AS ARTIST کے نام سے لکھی تھی، اور اس میں اس حقیقت کو واضح کیا تھا کہ ایک قاری، اور خصوصاً ادب کا قاری بہت بڑا فن کار ہوتا ہے۔ وہ اپنے انہماک اور ذوق وشوق سے ادیب کو تخلیق کی طرف راغب کرتا ہے، اور اُس کے جذب وشوق ہی کی بدولت ادبی تخلیقات وجود میں آتی ہیں۔ قاری نہ ہو تو ادب کی تخلیق ممکن ہی نہیں۔
اِن تمام پہلوؤں پر بحث کر کے ہالبروک جیکسن نے یہ نتیجہ نکالا ہے کہ پڑھنے والے کا احساس جمال، اُس کی فہم وفراست، اُس کا ذوق وشعور ہی تخلیق ادب کی مرہونِ منت ہوتا ہے، لکھنے والا اس حقیقت کو کبھی بھی نظر انداز نہیں کر سکتا۔ اس کو اپنی ادبی تخلیق کے لئے ایسے ہی قاری کی تلاش ہوتی ہے۔ ایسا قاری مل جائے تو اُس کو اپنا مقصد حاصل ہو جاتا ہے۔ اور اس کو شعوری اور غیر شعوری طور پر ایسے قاری کی تلاش رہتی ہے۔ جیکسن کی یہ کتاب بڑی ہی خیال انگیز ہے۔ جو پڑھنے والے کو نسبتاً ادبی فن کار سے بھی بڑا فن کار ثابت کرتی ہے۔

کیونکہ وہ اپنے ذوق وشعور سے لکھنے والے کی تخلیق کو از سرِ نو تخلیق کرتا ہے۔

افتخار عزیز صاحب ادب کے ایک ایسے ہی قاری ہیں۔ جب بھی اُن کا خیال آتا ہے تو ہالبروک جیکسن کے اِن خیالات کی عملی صورت میرے سامنے آجاتی ہے، اور میں اُن کی شخصیت میں ایسے ہی قاری کو دیکھتا ہوں جو خود پڑھنے کے کام کو ایک فن کا روپ دے دیتا ہے، اور جس میں ادیب کو اپنی اس فن کاری سے مُتاثر کرنے کی بڑی صلاحیت ہوتی ہے۔

افتخار عزیز صاحب پاکستانی ہیں لیکن کینیڈا میں رہتے ہیں۔ وہ اُردو شعر وادب کے رسیا ہیں۔ سات سمندر پار بیٹھ کر بھی وہ اُردو ادب کی نئی سے نئی کتابیں خریدتے اور پڑھتے ہیں۔ یہ اُن کا محبوب مشغلہ ہے، اور وہ اپنے فرصت کے اوقات مطالعے میں گذارتے ہیں۔ انہوں نے اپنے گھر میں ادبی کتابوں کی اچھی خاصی لائبریری بنالی ہے، اس لائبریری میں وہ اپنے ذوق کی کتابوں کو بڑے سلیقے سے رکھتے ہیں۔ یہ کتابیں انہیں جان سے بھی زیادہ عزیز ہیں۔

چند سال ہوئے اُن کے ایک عزیز میرے پاس دفتر میں آئے، اور اُن کے لئے میری چند نئی شائع ہونے والی کتابیں طلب کیں۔ افتخار عزیز صاحب کا غائبانہ تعارف کروایا، جس سے مجھے معلوم ہوا کہ وہ ادب کے سنجیدہ اور باشعور قاری ہیں۔ میں ایسے پڑھنے والوں کی تلاش میں رہتا ہوں۔ اس لئے میں نے انہیں اپنی کئی کتابیں دیں، اور کہا کہ "یہ کتابیں افتخار صاحب کی نذر ہیں" انہوں نے اِن کتابوں کی قیمت ادا کرنی چاہی تو میں نے کہا "اِن کتابوں کی کوئی قیمت نہیں ۔ مجھے ایک اچھا قاری مِلا۔ بس یہی اِن کتابوں کی قیمت ہے"۔

کتابیں افتخار صاحب کو پہنچ گئیں تو اُنہوں نے بڑی محبت سے مجھے خط لکھا، اور کتابوں کی تعریف کی جس سے مجھے معلوم ہوا کہ وہ اپنے قبیلے کے

آدمی ہیں۔ اُن کا ذوق ادب بہت اعلےٰ پائے کا ہے، اور یہ کہ وہ ادب کا مطالعہ تنقیدی زاویۂ نظر سے کرتے ہیں۔

پھر چند مہینے کے بعد افتخار صاحب خود ٹورنٹو سے لاہور آئے۔ مجھ سے ملے۔ پہلی ہی ملاقات میں مجھے یہ اندازہ ہو گیا کہ وہ نہایت باقاعدہ انسان ہیں۔ انسانی زندگی کی اعلےٰ او ر ارفع قدروں کے علم بردار ہیں۔ اُن کے سینے میں ایک درد مند دل ہے، اور وہ انسان دوست، مہذب، شائستہ اور محبت کرنے والے آدمی ہیں۔ ادب کا چسکا ہے اور وہ ادب کے ایک ذہین اور باشعور قاری ہیں۔

وہ لاہور میں کوئی ایک مہینہ رہے۔ اس زمانے میں اُن سے کئی ملاقاتیں ہوئیں۔ اُنھوں نے ان مُلاقاتوں میں زیادہ تر باتیں ادب اور ادبی کتابوں کے بارے میں کیں، اور کچھ میری کتابوں کا ذکر کیا۔ میں اپنی کتابوں کے ذکر سے بہت پریشان ہوتا ہوں۔ اپنی تعریف سے مجھے سخت اُلجھن ہوتی ہے لیکن افتخار صاحب نے اتنی محبت و بصیرت کے ساتھ ان کا ذکر کیا کہ میری پریشانی اور اُلجھن دور ہو گئی، اور میں ایک لفظ بولے بغیر اُن کی باتیں سُنتا رہا۔

کہنے لگے "آپ کی تمام کتابیں میرے کتب خانے میں موجود ہیں۔ میں انہیں نہایت شوق سے پڑھتا ہوں اور بار بار پڑھتا ہوں۔ ان میں درد مندی، دل سوزی اور انسانی ہمدردی کے جو عناصر ہیں، اُن سے میں متاثر ہوتا ہوں۔ اور پھر ان کا انداز بیان صاف اور سادہ ہے، اور ہر بات سمجھ میں آجاتی ہے۔ ایسی تحریروں سے مجھے اُلجھن ہوتی ہے جو گنجلک ہوتی ہیں اور جو سمجھ میں نہیں آتیں۔ آپ کی تحریروں میں یہ بات نہیں ہے۔ وہ سمجھ میں آتی ہیں۔ اُن میں سادگی کا حُسن اور حُسن کی سادگی ہے"۔

میں نے کہا "افتخار صاحب! یہ تو آپ کا حُسنِ نظر ہے، ورنہ ایمان کی بات تو یہ ہے کہ میں کبھی اپنی تحریروں سے مطمئن نہیں ہوتا۔ مجھے تو ان میں

بے شمار خامیاں نظر آتی ہیں۔ جوش صاحب نے کیا خوب کہا ہے "پوچھ شاعر سے کہ وہ کیا کہہ گیا کیا رہ گیا"۔

افتخار صاحب نے کہا "یہ خیالات آپ کی بڑائی کی دلیل ہیں"۔

غرض دیر تک افتخار صاحب اس طرح کی باتیں کرتے رہے۔ اُن کی باتوں میں جذب و شوق کی مہک تھی، اِس لئے میں نے کچھ نہ کہا، چُپ چاپ اُن کی باتیں سُنتا رہا۔

دوران قیام لاہور میں ایک دن مجھے اپنے گھر بھی بُلایا۔ پُرتکلف کھانے کا اہتمام کیا اور اپنے خاندان کے افراد سے میری مُلاقات بھی کروائی۔ یہ سب لوگ بھی مجھے نہایت شائستہ، مُہذب، پُرخلوص اور محبت کرنے والے لوگ معلوم ہوئے، اور میں اِن سب سے مل کر بہت خوش ہوا۔

افتخار صاحب کے والدین اور بھائی بہنوں سے مجھے معلوم ہوا کہ وہ ان سب کو بہت عزیز رکھتے ہیں، اور ہر سال صرف اُن سے مِلنے کے لئے زرِ کثیر صرف کرکے سات سمندر پار سے لاہور آتے ہیں۔

ایک ملاقات میں میں نے کہا کہ "یہ سب کچھ بھی اُن کی بڑائی کی دلیل ہے، ورنہ ہوتا یہ ہے کہ ملک سے باہر جا کر انسان خاصا بدل جاتا ہے۔ اس کی مصروفیت اور دلچسپیاں دیارِ غیر میں جا کر مختلف ہو جاتی ہیں ۔۔۔ میرا خیال ہے کہ یہ ادب کے مطالعے کا فیضان ہے۔ ادب انسان میں جذبات کی اہمیت کا احساس پیدا کرتا ہے اور انسانی رشتوں کے تقدّس کے جذبات کو بیدار کرتا ہے۔ انسانی رشتوں کے معاملے میں جذباتی ہونا بھی اچھی بات ہے۔ افتخار صاحب خاصے جذباتی آدمی ہیں، اور مجھے اُن کی یہ ادا بہت پسند ہے۔

افتخار صاحب کا معمول ہے کہ وہ ہر سال باقاعدگی سے لاہور آتے ہیں، اور میرے لئے قلم اور خوشبو کا تحفہ ضرور لاتے ہیں۔ لاہور میں وہ اپنے عزیزوں اور دوستوں سے مِلتے ہیں، اپنی دلچسپی کی ادبی کتابیں خریدتے ہیں، اور ان کو اپنے

ساتھ ہوائی جہاز میں کینیڈا لے جاتے ہیں۔

ٹورنٹو جاکر وہ مجھے خیریت کا خط لکھتے ہیں، اور میری جو نئی کتابیں اپنے ساتھ لے جاتے ہیں، اُن کے بارے میں اظہارِ خیال بھی کرتے ہیں، جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ انہوں نے خاصا وقت اِن کتابوں کے پڑھنے میں صرف کیا ہے، اور وہ اُن سے محظوظ ہوئے ہیں۔

میں اُن کی اِن تحریروں کے اقتباسات یہاں نقل کرتا لیکن اس میں خود ستائی کا پہلو نکلتا ہے۔ اس لئے صرف ایک کتاب کے بارے میں صرف دو تین جملے یہاں نقل کرنے پر اکتفا کرتا ہوں۔ میری ایک نئی کتاب "شاعری کیا ہے"؟ کے بارے میں لکھتے ہیں ــ

"پاکستان میں چندے آپ کی صحبت میسّر آئی۔ ذہن میں آپ کا جو خوبصورت ہیولا تراشا ہوا ہے، اُس کو مزید جلا نصیب ہوئی۔ رہی سہی کسر آپ کی کتاب 'شاعری کیا ہے'، نے پوری کر دی۔ ماشاء اللہ بہت ہی خوبصورت اور مفید کتاب ہے آپ کے قلم نے اس لطیف موضوع سے پورا پورا انصاف کیا ہے۔ اس کتاب پر آپ کی علمیت کی گہری چھاپ لگی ہوئی ہے۔ اللہ تعالےٰ آپ کے قلم کو سرسبز و شاداب رکھے، اور ہم سب اس کے ثمر سے بہرہ ور ہوں، آمین"!

آج کل ایسے پڑھنے والے ہمارے ہاں نہ ہونے کے برابر ہیں جو اس قسم کی کتابوں سے محظوظ ہوتے ہیں، اور اپنا قیمتی وقت ایسی کتابوں کے مطالعے میں صرف کرتے ہیں۔ بہر حال میں افتخار عزیز صاحب کی ایسی تحریروں کو دیکھ کر خوش ہوتا ہوں۔ اس لئے نہیں کہ ان میں میری تعریف ہے بلکہ اس لئے کہ اس دورِ پر آشوب میں بھی ایسے پڑھنے والے موجود ہیں جن کو اس قسم کی سنجیدہ تحریروں سے دلچسپی ہے۔ ورنہ اس عہدِ انتشار میں بقول

میر، اِس" فن بے اعتبار" سے، جس کو ہم نے اختیار کیا ہے بھلا کون دلچسپی لیتا ہے۔ افتخار صاحب ایسے پڑھنے والوں میں ایک منفرد حیثیت رکھتے ہیں۔ میں ان سے سیکھنے کی کوشش بھی کرتا ہوں۔

ہمارے ہاں آج کل سنجیدہ کتابوں کے مطالعے کا رجحان کم ہو گیا ہے۔ لوگوں کی دلچسپیاں اب کچھ اور ہو گئی ہیں۔ ریڈیو، ٹیلی ویژن، کھیل، تماشے، سیر و تفریح وغیرہ میں لوگ اپنا وقت زیادہ صرف کرتے ہیں اس لئے ایسے افراد کو غنیمت سمجھنا چاہیئے جو سات سمندر پار بیٹھ کر بھی ایسی سنجیدہ تحریروں سے دلچسپی لیتے ہیں، اور اُن کے مطالعے میں اپنا وقت صرف کرتے ہیں۔

افتخار عزیز صاحب اپنی کتابوں کو سینت سینت کر رکھتے ہیں۔ بڑی مشکل سے اپنی کتابیں دوسروں کو پڑھنے کے لئے دیتے ہیں۔ کسی کو کتابیں دینے کے لئے مجبور ہو جائیں تو کلیجے پر پتھر رکھ کر دیتے ہیں، اور پھر اِن کتابوں کی واپسی کا بے چینی سے انتظار کرتے ہیں۔ افتخار صاحب نے ایک خط میں اپنی اسی کیفیت کا اظہار اس طرح کیا ہے۔

"کچھ عرصے قبل میرے چھوٹے بھائی ذوالفقار ہمارے ہاں آئے ہوئے تھے۔ آپ کی کتابیں 'یادِ عہدِ رفتہ' اور 'آزادی کے سائے میں' دیکھ کر اُن کی رال ٹپکنے لگی۔ لہٰذا دِل پر پتھر رکھ کر کتابوں کو اُن کے حوالے کیا۔ وہ کتابیں لے کر جیمس بے، چلے گئے یقین کریں جب تک کتابیں دوبارہ وصول نہ پائیں طبیعت منقبض ہی رہی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے میرے دو مانوس پالتو کبوتر اُڑان بھر کے کہیں اور چلے گئے ہیں۔ جوں ہی وہ واپس اڈے پر پہنچے جان میں جان آئی، اور تعلقات کو از سر نو اُستوار کیا گیا، یعنی کتابوں کو مزے لے لے کر ایک دفعہ پھر پڑھ ڈالا۔ ذوالفقار بھی آپ کی کتابوں سے محظوظ ہوئے۔"

ایسے پڑھنے والے اور ادبی کتابوں سے اتنی دلچسپی لینے والے اِن دنوں خال خال ہی نظر آتے ہیں۔ افتخار عزیز صاحب کا یہ جذب وجنوں قابلِ داد ہے۔ اسی لئے تو میں اُن کی عزت کرتا ہوں، اور نہ صرف اَدب ایک مثالی پڑھنے والا سمجھ کر اُن سے محبت کرتا ہوں بلکہ اُن کے اس جذب وجنوں سے بہت کچھ سیکھتا بھی ہوں۔ کسی نے کیا خوب کہا ہے۔

عالم میں تجھ سے لاکھ سہی تو مگر کہاں

پروفیسر ڈاکٹر عبادت بریلوی

کی

زیرِ طبع کتابیں

(پندرہ سال کا منصوبہ)

① تحقیق و تنقید

۱۔ جہانِ غالب
۲۔ غالب معجز بیاں
۳۔ میر کی غزل
۴۔ منظوماتِ میر
۵۔ میر کا فن
۶۔ نظیر اکبرآبادی
۷۔ سرسید احمد خاں کے انشائیے
۸۔ مولانا الطاف حسین حالی
۹۔ داغ دہلوی
۱۰۔ علامہ اقبالؒ کی غزل
۱۱۔ جہانِ اقبالؒ
۱۲۔ علامہ اقبال کا فن
۱۳۔ صنفِ غزل کے بنیادی اصول
۱۴۔ اردو غزل کا ارتقا
۱۵۔ جدید اردو غزل
۱۶۔ اردو ادب کی تاریخیں
۱۷۔ اردو ادب کی ترقی پسند تحریک
۱۸۔ جدید اردو ادب
۱۹۔ فورٹ ولیم کالج کی ادبی خدمات
۲۰۔ اردو کی بپتا

② ادبی سوانح، تنقید!

۲۱۔ مولانا حسرت موہانی
۲۲۔ شاعرِ انقلاب حضرتِ جوش ملیح آبادی۔
۲۳۔ بابائے اردو ڈاکٹر مولوی عبدالحق۔
۲۴۔ جگر مرادآبادی

۲۵۔ فیض احمد فیض

۲۶۔ بہادر شاہ ظفر

۲۷۔ ڈاکٹر جان گلکرسٹ

۲۸۔ سید حیدر بخش حیدری

۲۹۔ میر امن دہلوی

③ تاریخ (تہذیبی وادبی)

۳۰۔ اُردو شاعری کی تنقیدی تاریخ

۳۱۔ اُردو افسانے کا ارتقا

۳۲۔ اورینٹل کالج میں تینتیس سال

۳۳۔ تاریخی مضامین

④ خاکے (شخصیات)

۳۴۔ آہوانِ صحرا

۳۵۔ شجر ہائے سایہ دار

۳۶۔ خوش نوایانِ چمن

۳۷۔ شوریدگانِ شوق

۳۸۔ صفیرانِ سحر

⑤ سفرنامے

۳۹۔ لندن کی ڈائری

۴۰۔ سفرنامۂ یورپ

۴۱۔ مشاہداتِ لندن

۴۲۔ مشاہداتِ ترکی

۴۳۔ مشاہداتِ ایران

⑥ ترتیب و تدوین

۴۴۔ دیوانِ مُبتلا (عُبید اللہ خاں مُبتلا)

۴۵۔ لطائف ہندی (للولال کوی)

۴۶۔ مقالاتِ عبدالحق (چار جلدیں)

۴۷۔ خطوطِ محمد حسن عسکری بنام ڈاکٹر عبادت

۴۸۔ خطوطِ پروفیسر سید احتشام حسین 〃

۴۹۔ خطوط احمد ندیم قاسمی 〃

۵۰۔ خطوطِ مشاہیرِ ادب بنام ڈاکٹر عبادت

ناشر

ادارۂ ادب و تنقید

۸۸۔ این، سمن آباد لاہور

فون ۴۱۲۹۸۸

ڈاکٹر عبادت بریلوی

آہوانِ صحرا

ادارۂ ادب و تنقید ○ لاہور